کُل کائنات بیتی

از

حضرت خواجہ حسن نظامی

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

دیباچہ

سورج ایک کائنات ہی۔ ستارے سب کے سب اپنے اپنے وجود میں ایک کائنات ہیں۔ آسمان بھی ایک مستقل کائنات ہے۔ اگر وہ وجود رکھتا ہے تب بھی نہیں رکھتا اور محض خانہ نظر ہے تب بھی۔

زمین بھی ایک کائنات ہی۔ اور اس کے اوپر ہر مخلوق اپنی اپنی حد اور جسامت اور وجود میں ایک کائنات ہی۔ اور سب پر ایک زندگی گزر رہی ہی اور سب اپنی کائنات کو لیکر کل کا جز اور جز کا کل بنے ہوئے دن گزار رہی ہیں اور ان سب کی حیات ایک بیتا ہے یا ایک بیتی ہی جو ان پر بیت رہی ہی۔

چاہتا ہوں کہ آج سے ہر روز کے مشاہدات مختصر طور سے لکھا کروں تاکہ انسان کو اپنی ہستی کے ساتھ ہی تمام جہان اور تمام کائنات کی بیتی کے مشاہدہ کرنے کا خیال ہو۔ کہ یہی مشاہدہ اصلاح و ترقی انسان کی کنجی ہے۔

حسن نظامی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کائنات بیتی

سورج بیتی

ہندو جس کرہ نورانی کو دیوتا مانتے ہیں۔ اور جس کو مسلمان خدا کی مخلوق سورج کہتے ہیں
سردی میں محبوب ہو جاتا ہے اور گرمی میں معتوب۔ جب سردیاں جاتی ہیں اور گرمیاں آتی ہیں تو
خدا کی ہر مخلوق سورج سے بچاؤ ڈھونڈھتی ہے۔
سائنس والے کہتے ہیں سورج سے اس زمین کی دنیا کو زندگی ملی ہے۔ مگر سورج سے پوچھو کہ
تیرا کیا حال ہے تو اپنی بیتی سُنا۔ تو سورج رو رو کر کہیگا۔ آگ ہوں۔ اوپر آگ نیچے آگ۔
دائیں آگ۔ بائیں آگ۔ اندر آگ۔ باہر آگ۔ دوزخ اگر گرم ہے تو میں ہوں۔ تکلیفوں کا
نام آتش فشانی ہے تو مجھ سے زیادہ کسی وجود کی کائنات میں آتش فشانی نہیں ہے۔

چاند بیتی

پیارے مکھڑے والے چاند کی بیتی سُنو۔ چاند رات کو گود کا نونہال بنکر نظر آتا ہے۔ چودھویں
کو جوانی کی بہار دکھاتا ہے۔ دمکتا ہے۔ جگمگاتا ہے۔ بچے سے لیکے بوڑھے تک کے من کو بھاتا ہے
دنیا کے محبوبوں کی صورت بیان کرتے ہیں تو چاند کے چہرہ سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ مگر چاند کہتا ہے
ایک کائنات ہوں ایک کرہ ہوں۔ مجھ میں بھی کبھی تمہاری زمین کی طرح مخلوق بستی تھی۔ مگر

۱۰ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ
۱۰ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ

ہی میں چمکتی ہے۔ میں بہروپیہ ہوں۔ میرے بے شمار روپ ہیں۔ رات کو میرا روپ الگ ہے
دن کو میرا روپ اور ہے۔ برسات میں کچھ اور، سردی میں کچھ اور، گرمی میں کچھ اور، صبح کچھ اور،
دوپہر کو کچھ اور، شام کو کچھ اور۔ مگر میں یہ سب کچھ دوسروں کے لئے ہوں اپنے لئے خبر نہیں
میں کیا ہوں میں کیوں ہوں اور میرے ظہور سے خالق کائنات کا کیا منشا تھا۔

جمادات بیتی

خاک بیتی

میں ہوں مٹی، خاک جسکو انسان خاک دھول کہتا ہے اور جس پر مغرور ہوکر
چلتا ہے اور جس سے اس کا پتلا بنا ہے اور جس میں مرنے کے بعد دفن ہوتا ہے
یا جلکر، راکھ بنکر ملجاتا ہے۔ میں وہی خاک ہوں، میں وہی مٹی ہوں۔
میرا نام ایشیا ہے۔ مجھی کو یورپ کہتے ہیں، افریقہ اور امریکہ بھی میرا ہی نام ہے
میں ہی یورپ میں گورے، افریقہ میں کالے، ایشیا میں سرخ و سفید و زرد آدمی بناتی ہوں
یا آدمیوں کی صورت بنتی ہوں۔ میں ہی وہ مٹی ہوں جو سمندروں کو اپنے اوپر اٹھاتی ہے
اور دریا جس کے آغوش میں بہتے ہیں۔ اور میں ہی وہ خاک ہوں جس کے کلیجہ میں سوراخ
کرکے انسان اور حیوان کو سیراب کرنے والے کنوئیں بنائے جاتے ہیں۔
میں نہ تھی، مگر میں تھی، میں نہیں ہوں مگر کہا جاتا ہے اور مانا جاتا ہے کہ میں ہوں۔
جس دن کن کی صدا سرمدی نغمہ میں بلند ہوئی اور کائنات پردہ عدم سے پلک
جھپکتے یکایک نمودار ہوگئی تو میں بھی اپنے ذرات کو سمیٹتی ہوئی منظر شہود پر آگئی۔ کن
سے پہلے یقیناً میں نہ تھی۔ لیکن کن سے پہلے یقیناً میں تھی۔ جب میں بصورت کائنات نہ تھی
تب بھی کن کہنے والے کے علم میں میری ہستی موجود تھی اور جب کن کہنے کے بعد میں نمودار ہوگئی
تب بھی کن کہنے والے کے علم میں میرا وجود موجود رہا اور کائنات نے بھی عالم ناسوت میں مجھے
دیکھا کہ موجود ہوں پھر بھی کہتی ہوں کہ میں نہ تھی اور میں نہیں ہوں اور میرا ہونا واجب الوجود
ذات کے سامنے نہ ہونے کے برابر ہے۔

میری بیتی

یہ ہے کہ مجھکو بہت چھوٹے چھوٹے ذرات جوڑ کر بنایا گیا ہے اور میرے وجود میں
اتنے ذرے ہیں کہ ان کا شمار محال اور ناممکن ہے۔ ایک مٹھی خاک میں
کئی کروڑ ذرے ہوتے ہیں، میں اس کائنات میں کن کہنے والے کی مٹھی سے بھی کم ہوں

لیکن پھر بھی اتنی بڑی ہوں کہ لاکھوں میل کا سمندر ایک پیالہ کی طرح میرے ہاتھ میں ہے اور لاکھوں میل کی زمین ایشیا اور یورپ افریقہ اور امریکہ میں میرے ہی ادنےٰ ادنےٰ ذرات کے جمع ہونے سے نظر آ رہی ہے۔

سمندر کی تہ میں ہوا اور سورج کی روشنی مجھکو نہیں دیکھتی اور سمندر کا پر جوش پانی مجھکو اپنے پیروں میں کچلتا رہتا ہے اور دریا جب بہتے ہیں تو میرے بدن کو کھرچتے ہوئے چھیلتے ہوئے اور میرے ذروں کو اپنے جوش اور روانی کے زور میں اچھالتے ہوئے بہتے ہیں اور اُن کا یہ خیال ہوتا ہے کہ آج ہم اس خاکسار زمین کو تہ تک نیست نابود کر دینگے مگر میں نہ نیست ہوتی ہوں نہ نابود چند میل دریا کے ساتھ بہتی ہوں پھر جہاں جی چاہتا ہے ٹھہر کر اپنی تہ میں بیٹھ جاتی ہوں اور پھر دریا کے مغرور پانی سے کہدیتی ہوں کہ بس میاں جاؤ بہت زور دکھا چکے تمکو فضا کی حرارت نے اوپر اُٹھایا پھر بارش بنا کر برسایا تم موریوں میں پرنالوں میں رواں دواں پھر رہے تھے۔ میں نے اپنے ہاں پناہ دی تم آئے اور تم نے میرے سینہ پر بہنا شروع کیا۔ اور ایسے آپے سے باہر ہوئے کہ میرے احسان کو بھول گئے اور لگے جوش و خروش دکھانے۔ تم نے میرے ذروں کو ناچیز سمجھا۔ اور اپنی تیز چھریوں سے کچوکے دیدیکر ساتھ لیا اور انکو غوطے دیتے ہوئے زیر و زبر کرتے ہوئے کوسوں تک بہاتے لئے چلے گئے۔ مگر اب میں تم کو اپنی طاقت کا تماشہ دکھاتی ہوں جاؤ جاؤ سمندر میں ملکر فنا ہو جاؤ۔ میرے ذرے اب بیٹھ گئے۔ اب تمہاری مجال نہیں جو اُن خاکی ذروں کو ستا سکو اور اپنے ساتھ بہنے کے لئے مجبور کر سکو۔

اُو ہوا۔ اپنے جوشش ستمرانی کو چھوڑ تو جو آندھی بنکر اٹھتی ہے تو جو میرے ذرات کو وطن سے جدا کرنا چاہتی ہے یہ اچھا نہیں ہے۔ میرا کیا ہے میں تو خاک ہوں۔ مجھکو ہاتھی روندتے ہیں، گھوڑے پامال کرتے ہیں۔ گدھے اور بیل شیر اور بکری کتّے اور بلیاں اور سب ہی انسان اور حیوان مجھکو پامال کرتے ہوئے چلتے ہیں اور میں اُنکو اپنے پیٹ سے نکلا ہوا بچہ اور اپنے پیٹ میں آنے والی خوراک سمجھکر کچھ نہیں کہتی۔

تو کیا تو نے میرے اس صبر و تحمل کو دیکھکر یہ سمجھا ہے کہ میں کمزور ہوں اور کمزور کو ستانا قدرت کا قانون ہی نہیں قدرت کا یہ قانون نہیں ہے اس نے ہر بڑے سے بڑے وجود اور ہر بڑی سے بڑی ہستی کو جتنی طاقت دی ہے اتنی ہی

۱۰ ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ

طاقت ایک ادنیٰ سے ادنیٰ وجود اور چھوٹی سی چھوٹی ہستی کو بھی دی ہے۔ میں دیکھنے میں بے جان خاک نظر آتی ہوں اور مجھکو مردہ سمجھکر ہر ایک کو حقیر سمجھنے اور پامال کرنے کی جرأت ہو جاتی ہے مگر میں نہ کمزور ہوں نہ میں مردہ ہوں نہ میں حقیر اور بے حقیقت ہوں ہوا۔ ہوا۔ اری او چلنے والی ہوا ـ اری او لڑکھڑانے والی ہوا۔ اری او نظر نہ آنے والی ہوا۔ سن میں تجھ سے کہتی ہوں کہ میرے ہر ذرے میں جان ہے اور اس جان میں مکمل زندگی ہے۔ اور اس جان میں بے شمار تمنائیں ہیں۔ آرزوئیں ہیں، اور بے شمار ارمان ہیں جس طرح ہر جان اپنی حفاظت اور اپنی بقا کے لئے جنگ و پیکار کرنی چاہتی ہے اسی طرح مجھ خاک کے جاندار ذرے بھی اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت آمادہ اور تیار ہیں۔ ہم کو اپنے مولا و پروردگار کے قانون قدرت سے سرتابی کی مجال نہیں۔ اسی لئے ہم انسان اور حیوان کے پیروں میں پامال ہوں اور دریاؤں میں بہیں اور سمندروں کو اپنی گود میں رکھیں اور سبزہ کو اپنے جسم سے اُگنے کی اجازت دیں۔ اور تو بھی جب آندھی بنکر آئے تو تیرا ساتھ دیں۔ لیکن یہ نہ سمجھ کہ خاک تیرے سامنے ادنیٰ ہے، ناچیز ہے۔ دیکھ میں خاک تجھکو اپنی طاقت دکھاتی ہوں۔ تیرے بازوؤں پر چڑھ جاتی ہوں۔ تیرے سر پر بیٹھکر دھوم مچاتی ہوں۔ یہ بھی تو دیکھ میں انسان کی آنکھوں میں آج گھس رہی ہوں، کانوں میں گھس رہی ہوں ناک میں گھس رہی ہوں اور اس کے مکلف لباسوں کو اور صاف مکانوں کو اور اُجلے بچھونوں کو غبار آلود بنا رہی ہوں۔ میلا کر رہی ہوں۔

بیتی بیتی

مجھے تو اپنی بیتی بیان کرنی ہے میں تو ایک کائنات ہوں "خاک کی بستی" ہوں، مٹی کی اقلیم ہوں۔ مجھے ہوا سے لڑائی باندھنا زیبا نہیں۔ میں تو اپنی سرگذشت بیان کرنے آئی ہوں، مجھے کیا ہو گیا۔ میں تو کچھ اور کہنے لگی۔ مجھے تو کچھ اور خیال آگیا۔

میں خاک، میں خاک، میں مٹی میں مٹی۔ میں راکھ، میں راکھ۔ میں دھول میں دھول میں کیوں ہوں، میں کہاں سے ہوں۔ میرا انجام کیا ہوگا، مجھ پر کیا گذر گئی۔ مجھپر کیا بیت رہی ہے۔ کون سُنے؟ کس کو سُناؤں۔ کون سمجھے، کسکو سمجھاؤں۔ جو موررکھ ہو وہ جانے جو ہوشیار ہو وہ کیا سمجھے اور کیا پہچانے۔ میں آدم ہی سب کا باپ کہلائی ہابیل قابیل ہی لڑائی کی ٹھیرائی، نوح بنی ڈوبنی، تیر بنی۔ طوفان کو لائی۔ پھر

۱۲- ذیقعد ۱۳۴۵ھ

طوفان کے سر اپنی کشتی چلائی۔ میں موسیٰ بنی اور پھر ان کے سامنے فرعون خدائی کا دعویدار بنکر آئی۔ ایک طرف طور پر گئی خدا سے توریت لائی، دوسری طرف دریا میں ڈوبی اور بنی اسرائیل سے شکست کھائی۔

عیسیٰؑ میں ہی تھی، لمبا کرتا پہنا، لمبے بال بڑھائے۔ بیماروں کو تندرست کیا، اندھوں کو بینائی دی، مردوں کو زندگی بخشی، پھر میں یہودی بنی، رومی بنی، اور عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھا دیا سولی کی لکڑی بھی میں تھی، مصلوب عیسیٰ بھی میں تھی، سولی کا حکم دینے والا حاکم بھی میں تھی سولی کا حکم لینے والے یہودی بھی میں تھی، سولی پر چڑھانے والی جلاد بھی میں تھی، اگر نہیں میں کہاں تھی وہ تو آدمی سکتے گوشت پوست کے بنے ہوئے جاندار کہلانے والے میں تو خاک ہوں بے جان کس نے کہا میں بے جان ہوں، میری بیتی تو آدم سے لیکر مسیح تک صاحب حیات، زندہ اور سراپا زیست نظر آتی ہی۔

پھر اور سنو، پھر اور دیکھو۔ عرب میں اور حجاز میں ایک مقام مکہ تھا، وہاں میں ایک یتیم بنی، یں نے باپ کو نہ دیکھا، میں لاوارث ماں بنی، اور پھر اس یتیم کو گود میں لیا پھر میں حلیمہ بنی اور اسں یتیم کو دودھ پلایا۔ پھر میں بکریاں چرانے کھڑی ہوئی۔ میرا گورا گورا رنگ، میری بھولی بھولی صورت، میرے لال لال گال، میرے پیارے پیارے ہونٹ، میری بڑی بڑی آنکھیں انمیں گلابی گلابی دوڑے، اُن پر کالی کالی پلکیں، اُن میں ملکا ملکا سرمہ، دانت میرے موتی سے زیادہ چمکدار، بال میرے لمبے کندھوں پر پڑے ہوئے۔ گھونگر والے، ہاتھ میں میرے لکڑی، سامنے میرے بکریاں، میں انکو چراتی تھی، میں اپنے وطن سے دور جنگل میں بکریوں کی رکھوالی کرتی تھی، میں وہی یتیم ہوں جس نے پیدا ہونے سے پہلے باپ سے جدائی اور پانچ برس کی عمر میں ماں سے جدائی کا دُکھ اُٹھایا اور میں ہی وہ یتیم ہوں جس کے لئے فرشتے آسمان سے نازل ہوئے۔ اور سینہ چاک کرکے دنیاوی آلائش صاف کی اور نور سے سینہ بھر دیا۔

پھر یہی یتیم تجارت کے لئے ملک شام میں گیا۔ پھر اسی یتیم کی حضرت خدیجہ سے شادی ہوئی۔ پھر یہی یتیم مامور من اللہ ہوا۔ وحی کی تجلیاں اس پر نازل ہوئیں۔ مجھ سے اسکا پتلا بنا تھا۔ لیکن وہ تجلیاں ہر خاکی پتلے پر نازل نہیں ہوتیں یہ پتلا تو ساتوں آسمانوں کو طے کرکے عرش اعظم پر گیا۔ موسیٰؑ سے ذات مطلق نے کہا تھا جوتیاں اُتار کر آؤ۔ مگر جب یہ یتیم عرش اعظم پر گیا تو ذات مطلق نے کہا جوتیوں سمیت آجاؤ۔

میں اپنی بیتی میں اس واقعہ پر جتنا فخر کروں کم ہے کہ میں خاک مگر اس خاکی پتلے کے طفیل میری یہ عزت کہ ذات مطلق نے پاس بلایا اور اتنا پاس بلایا کہ کمان کے دونوں حصوں کی نزدیکی سے بھی نزدیکی ہو گئی۔ ذات مطلق نے فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ کے بلیغ اور پُر اسرار الفاظ سے حقیقت بیان کی۔ یعنی اس نزدیکی کے وقت اپنے بندے سے ذات مطلق نے کچھ کہا اور خبر نہیں کیا کہا۔

ذات مطلق نے "عبد" کا لفظ استعمال فرما کے مجھ مشت خاک کی شان بڑھائی کہ وجود محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) میں عبدیت کا جتنا حصہ تھا اس میں مجھ ناچیز خاک کو بھی دخل تھا کہ ذات محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا بشری پیکر خاک ہی سے بنا تھا اور عبدیت کا لفظ اسی پیکر خاک کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ذات مطلق نے ذات محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے بزبان وحی جو بات کی وہ بات درحقیقت ذات مطلق کی خود اپنی ہی ذات سے بات تھی عبدیت کو تو ایک مجازی آئینہ بنا لیا گیا تھا اور چونکہ عبدیت کا مجازی آئینہ مجھ خاک کے خمیر سے بنا تھا۔ اس واسطے میں اس پر فخر کرتی ہوں۔ جھومتی ہوں وجد میں آتی ہوں۔

وجود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معراج سے واپس آیا۔ تو میں نے یہ دیکھا کہ وہ ایک وقت معراج میں ذات مطلق سے قریب ہوتا ہے۔ ایک وقت اہل وعیال میں مصروف نظر آتا ہے۔ ایک وقت اس کی شان شاہانہ حکومت کرتی ہے۔ ایک وقت وہ خطیب اور واعظ نظر آتا ہے۔ ایک وقت وہ فوجوں کا سردار اور سپہ سالار بنتا ہے۔ ایک وقت وہ سب سے بڑا نبی ہے۔ اور ایک وقت اس کی زبان کہتی ہے میں مسکین ہوں، مسکینوں میں رہتا ہوں۔ مسکینوں کو پسند کرتا ہوں اور مسکینوں ہی میں میرا حشر ہوگا۔

یہ مجھ خاک کی بیتی ہے۔ ذات مطلق نے سچ فرمایا تھا۔ کل یوم ھو فی شان میری بیتی میں ہر جگہ اور ہر پیکر میں ہر وقت ایک نرالی شان نظر آتی ہے۔ میں ہی وہ خاک ہوں جو ابوبکرؓ میں تھی۔ میں ہی وہ خاک ہوں جو عمرؓ فاروق میں تھی۔ میں ہی وہ خاک ہوں جو عثمان غنیؓ اور حیدر کرار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں تھی۔ ظلم کے زہر سے شہید ہونے والا حسنؓ ابن علیؓ کا پتلا بھی مجھ ہی سے بنا تھا اور وہ حسینؓ ابن علیؓ ماں باپ کا لاڈلا — نانا کا دل آرا۔ رسول اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دوش پر سوار ہونے والا جس کو

رسول اعظم کے ہونٹ پیار کرتے تھے جب ۱۰ محرم کو کربلا کی گرم ریت پر تیز دھوپ میں ظلم و ستم سے پچھاڑا گیا اور سفاک خنجر اس کے حلق پر رکھا گیا تو مجھ خاک کا بستر اس کے نیچے تھا اور مجھ ہی خاک کا غبار اس کے چہرے پر اور اس کے بالوں میں نظر آتا تھا۔ اور میں ہی وہ خاک تھی جس پر خنجر چل رہا تھا۔ جس کے تیر مارے گئے تھے۔ جس کے برچھیوں کے زخم لگے تھے ورنہ جس ذات کا نام حسین تھا اس کو نہ تیر لگے نہ برچھی اور اس کو نہ خنجر ذبح کر سکے نہ تلوار۔ یہ سب اذیتیں تو مجھ خاک کے لئے تھیں کہ میں ہی پیکر حسین میں تھی۔ سمائی ہوئی چیز کچھ اور تھی وہ امر تھا۔ جو آمر کے پاس چلا گیا۔ کربلا کی جلتی تپتی زمین پر تو میں پڑی رہی۔ گھوڑے تو مجھ پر دوڑے، پامال تو مجھے کیا گیا۔

اپنی بیتی کے جس حصہ کو بیان کر رہی ہوں وہ بڑا مزیدار ہے۔ میں پیکر حسینؑ میں شمر کے خنجر سے خونم خون پڑی تھی۔ سامنے عمرو بن سعد اور عبید اللہ ابن زیاد کی خونی فوجیں تھیں۔ دوسری طرف حسینؑ مظلوم کے گھر والوں کے خیمے تھے جنکو لوٹا جا رہا تھا۔ جلایا جا رہا تھا۔ عورتوں کے سروں سے چادریں بھی اتاری جا رہی تھیں حسینؑ کی مظلوم بہن زینبؓ غم کی تصویر بنی ہوئی بھائی اور بچوں کی لاشیں دیکھ رہی تھیں۔ مظلوم حسینؑ کی پیاری بیوی، شہنشاہ ایران کی بیٹی شہربانو اپنے دودھ پیتے بچے علی اصغرؑ کی لاش کو خون میں ڈوبا ہوا بے جان پڑا دیکھتی تھیں اور روتی تھیں۔ انکو اپنے جوان لڑکے علی اکبرؑ کی لاش بھی میدان میں نظر آتی تھی۔ جس کے سینہ پر ظلم کی برچھی لگی تھی اُن کے برابر انکی چھوٹی اور معصوم لڑکی سکینہؓ بھی کھڑی تھی۔ جو بھوک پیاس سے بیتاب تھی۔ جس کا پھول سا چہرہ عراق کی گرمی سے کملا رہا تھا اور جو باپ اور بھائیوں کی لاشوں کو دیکھ رہی تھی مگر سمجھ نہ سکتی تھی کہ وہ قتل کر دئے گئے اور اب وہ اس خاک کی دنیا میں اس سے نہیں مل سکتے۔ اس لئے جب اس معصومہ کے طمانچے مارے جاتے تھے تو وہ بے تاب ہو کر باپ کو اور بھائیوں کو مدد کے لئے پکارتی تھی۔

اس کے پاس ہی عابد بیمار۔ زرد چہرہ نڈھال صورت آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑے تھے اور حریف انکو قتل کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔

پھر ان سب کے ہاتھوں میں رسیاں باندھی گئیں۔ انکو قیدی بنایا گیا۔ اور انکو اونٹوں کی ننگی پیٹھ پر بٹھایا گیا۔

یہ سب میری ہی بیتی تھی۔ حسینؓ کے اندر میں تھی۔ علی اکبرؓ کے اندر میں تھی۔ علی اصغرؓ کے اندر میں تھی۔ زینبؓ اور سکینہؓ اور عابدؓ کے پیکر بھی میرے ہی تھے اور جن جلادوں اور سفاکوں نے ان مسافر اہل بیت رسول پر ظلم کئے تھے اُن کے اندر کون تھا۔ شمر کس سے بنا تھا۔ ابن زیاد، عمرو بن سعد، خولی ابن یزید۔ یزید ابن معاویہ یہ سب بھی مجھ ہی خاک سے تیار ہوئے تھے۔

ایک طرف میں خیر کا ظہور اور مظہر تھی۔ دوسری طرف شر کا اظہار میرے ذریعہ ہوا تھا الخیر والشر من اللہ تعالیٰ کی تفسیر میں تھی۔ خنجروں، تلواروں اور نیزوں کے پھل لوہے کے تھے اور دستے لکڑی کے تھے۔ مگر لوہا اور لکڑی بھی مجھ ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ گھوڑے جن پر دشمن سوار تھے اور جو حملے کرتے تھے اور وہ گھوڑے جن پر اہل بیت سوار تھے اور وہ دشمن سے بچاؤ کرتے تھے یہ بھی سب مجھ ہی خاک سے بنے تھے۔ کوفہ کی زمین جس کی حرص ابن زیاد کو تھی۔ شام کی زمین جس کا مالک یزید ابن معاویہ بننا چاہتا تھا۔ رے کی زمین جس کے لالچ میں عمرو بن سعد اہلبیت کے مقابلہ میں تلوار کھینچکر آیا تھا یہ سب میرے ہی ذروں سے مراد کر مجھ ہی ناچیز خاک کے لئے اور میری ہی ملکیت کے واسطے یہ سب خاک کے پتلے لڑتے تھے۔ اور ظلم و ستم کرتے تھے۔ ذات مطلق نے ذات محمدؐ کے ذریعہ انکو قرآن مجید میں فرما دیا تھا کہ اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ ملک کا مالک تو اللہ ہے تم نہیں ہو مگر یہ حریص یہ غافل یہ بے خبر نہ مانے نہ سمجھے اور اُنہوں نے میری ملکیت کے لئے معبود کی ملکیت کو فراموش کردیا۔ چند روز دیکھنے کے لئے اور سننے کے لئے مالک بن بھی گئے لیکن آخر میں میں قبر بنی اور ان سب کو نگل گئی۔

میں خاک ہوں، میری بیتی کیا خاک سنو گے۔ میں ایک حصہ زندگی کو بیان کرنا چاہوں اور سمندر کو دوات بنایا جائے اور تمام دنیا کے درخت قلم ہو جائیں تب بھی میری بیتی بیان نہیں ہو سکے گی۔ میں نمرود ہوں۔ میں فرعون ہوں۔ میں ہامان ہوں۔ میں شداد ہوں میں تیمور ہوں۔ میں چنگیز ہوں۔ میں ہلاکو ہوں۔ میں نادر ہوں۔ میں نپولین ہوں۔ دنیا میں ہلاکت پیدا کرنے والی۔ خدائی کا دعوے کرنے والی۔ آخرت کی بہشت سے بے خبر ہو کر دنیا کی بہشت بنانے والی میں ہوں۔ مچھر کے ایک ڈنک سے ہلاک ہو جانے والی بھی میں ہوں۔ پانی کے ایک غوطہ میں ڈوب کر مر جانے والی بھی میں ہوں۔

میں افلاطون ہوں۔ میں ارسطو ہوں۔ میں سعدی ہوں۔ میں حافظ ہوں۔ میں شکسپیر ہوں۔ میں ہربرٹ سپنسر ہوں۔ میں ملٹن ہوں۔ سب فلسفے۔ سب سائنس سب علوم

سب اخلاق، سب فنون میرے ہی منہ سے نکلے ہیں۔ امریکہ کا اڈیسن بھی میں ہوں ہندوستان کا گاندھی اور رویندرا ناتھ ٹیگور بھی میں ہوں۔

اور حسن نظامی بھی میں ہی ہوں، جس کی زبان میں بول رہی ہوں جس کے قلم سے لکھ رہی ہوں اور جس میں سما کر آپ بیتی سُنا رہی ہوں۔

مگر نہیں میں نہیں ہوں۔ نہ میں کبھی تھی۔ نہ میں ہو سکتی ہوں میں نے سنا ہے یہ خاک کے پُتلے ذات مطلق کا بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں "ہمہ اوست"، سب کچھ وہی ہے میں کہتی ہوں "ہمہ" کیا ہے اور "کیا ہے" "است" کیا ہے جس سے "ہمہ اوست" کا لفظ بنا ہے نہ "ہمہ" کچھ ہے نہ "اور" کچھ ہے نہ "است" کچھ ہے۔

ناسوت ایک مقام کا نام ہے اس کے بعد اس سے اونچا ملکوت ہے۔ لاہوت ہے جبروت ہے ہاہوت ہے۔ الفاظ میں نہ آسکنے کے قابل کیفیات کو خاک کے پتلے نے بیان کرنا چاہا۔ اور ان کیفیات کے فرق اور درجے سمجھانے چاہے تو کہدیا کہ اس درجہ کا نام ناسوت اور اس کا نام ملکوت اور اس کا نام جبروت اور اس کا نام لاہوت اور اس کا نام ہاہوت ہے۔

مگر نہ میں ہوں نہ یہ الفاظ ہیں۔ اصل تو کوئی اور ہی چیز ہے ہم سب تو ایک عکس ہیں ایک سایہ ہیں۔ ایک جھلک ہیں۔ آئینہ میں نظر آنے والی صورت ہیں۔ جبتک صورت آئینہ کے سامنے ہے آئینہ میں کچھ نظر آتا ہے صورت ہٹی آئینہ صاف ہے۔ کون آئینہ میں سمایا اور کون غائب ہو گیا۔ بیتی تو اس کی سننی چاہیئے۔ مجھ خاک کی بیتی میں کیا رکھا ہے۔ میں تو جب سے ہوں اور جب تک ہوں اور جب تک رہوں گی کہ ذات مطلق کی توجہ اس موجودات اور اس محسوسات کی کائنات کی طرف ہے۔ جس دن اس کی توجہ دوسری طرف ہوئی تو پھر نہ میں ہوں نہ میری یہ خاکی مورتیں۔

شاعر نے تو یہ کہا تھا:۔

دم کے ہیں سب دم دمے جب دم نہیں تو کچھ نہیں　　ساری دنیا ہیچ ہے جب ہم نہیں تو کچھ نہیں

میں کہتی ہوں دم میں خاکی پیکر کا الف لگایا تو آدم ہو گیا اور جب وہ خاکی پیکر دم سے جدا ہوا تو دم رہ گیا۔ دم کہیں نہیں جاتا خاک اس سے جدا ہو جاتی ہے جس کو تم مرنا کہتے ہو وہ موت دم کو نہیں آتی۔ قرآن مجید میں ذات مطلق نے اس دم کو "امر" کہا ہے اور سنسکرت میں اس دم کو امر کہتے ہیں۔ یعنی وہ چیز جو مر نہ سکے تو یہ کہنا کہ

جب وہم نہیں تو ہم نہیں صحیح نہیں ہے۔ وہم تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ وہم ذات مطلق کا حکم ہے
اور حکم حاکم کے وجود کے ساتھ رہتا ہے۔ امر آمر سے جدا نہیں ہے۔ جدا تو ہم خاک باد
آب آتش اربعہ عناصر ہیں۔ ہندوؤں نے پانچواں عنصر آکاشں کو مانا ہے۔ انگریزوں
نے بے شمار عناصر دریافت کئے ہیں۔ عناصر چار ہوں یا پانچ۔ دس ہوں یا بیس۔ سو ہوں
یا ہزار۔ لاکھ ہوں یا کروڑ سب فانی ہیں۔ سب میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور سب کا وجود
وہمی ہے۔ خیالی ہے، عکسی ہے، مثالی ہے۔ اصل قائم اور ابدی وجود تو ذات مطلق کا ہے
جس کے "کُن"، کہدینے سے ہم سب کمر بستہ ہو کر میدان کائنات میں حاضر ہو گئے ہیں۔
عناصر چار مانے گئے ہیں۔ خاک۔ پانی۔ آگ۔ ہوا۔ ہندو پانچ عنصر مانتے
ہیں اور اُنکو پانچ تت کہتے ہیں انہوں نے پانچواں عنصر آکاش یعنی آسمان اور زمین
کے درمیانی خلاء کو مانا ہے۔

میں کہتی ہوں کہ میں چوتھا عنصر خاک ہوں یا پانچواں تت مٹی ہوں لیکن
پانی بھی مجھ میں ہے ہوا بھی مجھ میں ہے۔ آگ بھی مجھ میں ہے۔ اور آکاشں اور خلا بھی میرے
آس پاس ہے۔ میں گول ہوں گیند کی طرح یا سپاٹ ہوں دالان کے فرش کی طرح۔
یا لمبی ہوں مینار کی طرح۔ کیسی بھی ہوں مگر خاک ہوں۔ سورج میرے مجموعہ کو کھینچے
ہوئے کھڑا ہے اور میں اُس کے آس پاس قربان ہو رہی ہوں یا میں ایک جگہ قائم
ہوں اور سورج چاند اور سب ستارے میرے آس پاس گردش کر رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو
مگر میں خاک ہوں۔ میرے خاکسار ہونے اور گرد و غبار کہلانے میں ان فلسفیانہ دلیلوں
سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

قوت نمو

میں گھٹتی بڑھتی نہیں۔ جب سے کُن کہا گیا۔ اس وقت سے آجتک اتنی
ہی ہوں جتنی تھی۔ اور اتنی ہی رہوں گی جتنی ہوں۔ نہ ایک ذرہ بڑھیگا
نہ ایک ذرہ گھٹیگا۔ مگر مجھ سے بنا ہوا انسان کہتا ہے کہ انسان اور حیوان اور نباتات میں
نمو کی یعنی بڑھنے کی قدرت ہے اور جمادات اس قوت سے محروم ہیں اور چونکہ مجھ خاک
کو جمادات میں شمار کیا گیا ہے اس واسطے انسان کہتا ہے کہ خاک میں نمو نہیں ہے۔

کوئی میرے تپنے سے کہے کوئی میری مورت سے سوال کرے۔ کوئی مجھ سے بنے
ہوئے کھلونے کے کان میں کہے کہ دیوانے آدمی یہ تو بتا کہ نباتات حیوانات اور انسان

۱۳- ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ

کے نمو کو مانتا ہے اور خاک کے نمو سے انکار کرتا ہے تو نباتات اور حیوانات اور انسان کس چیز سے بنے ہیں؟ - یہ بھی تو سب خاک کی صورتیں ہیں۔ اگر ان کے نمو کو مانتا ہے تو خاک کے نمو کو بھی مان۔

بڑ کے بیج کی بیتی

بڑ کا بیج رائی کے دانے کی برابر چھوٹا سا مجھ خاک کے ذرّوں میں چپ چاپ پڑا تھا۔ میں نے اس کے نیچے فرش بچھایا تھا۔ میں نے اس کے سرہانے تکئے بھی رکھے تھے۔ میں نے اس کے اوپر اپنے ذرّوں کی ایک ہلکی سی چادر بھی ڈالی تھی۔ بڑ کا بیج کہہ رہا تھا کہ دنیا کے غل و شور سے میں تھک گیا۔ ذرا مجھکو آرام کرنے دو۔ میں نے اس کو گود میں لیا اور کہا تو سو جا میرے ہریالے! تو سو جا میرے ہریالے! جب تو پڑیگا دنیا کے پھندے تو پھر نہ نیند ہوگی نہ آرام۔

بڑ کا بیج میری گود میں تھا کہ بادل گرجا۔ گھٹا آئی۔ پانی برسا۔ میں بھیگ گئی۔ اور میں نے بڑ کے بیج کو اپنی گہرائی کے اندر دبوچ لیا۔ اس کے بعد میں نے سورج سے کہا کہ یہ انسان کہتا ہے خاک میں نمو نہیں ہے۔ مجھے تھوڑی سی گرمی دے ہوا سے کہا تو بھی مجھے تھوڑی سی تاثیر دے۔ ان سب نے کہا تو نہ مانگے جب بھی قانون قدرت کے بموجب ہم تیری مدد کریں گے اور اس حقیر ناچیز بڑ کے بیج کو ایک بڑا درخت بنا دیں گے۔ بڑ کے بیج نے حیران ہو کر پوچھا کیا میں بڑا درخت بنجاؤنگا۔ تو میں نے اس بیج کو دور سے ایک بڑا درخت بڑ کا دکھایا کہ یہ جو تجھکو ظاہر میں نظر آتا ہے۔ یہ سب تیرے باطن کے اندر پوشیدہ ہے۔ بڑ کے بیج کو بہت حیرت ہوئی۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کا بدن گرم ہو رہا ہے۔ میں نے کہا پیارے لاڈلے کیا تجھے بخار ہے۔ بیج نے کہا معلوم نہیں۔ میں نے کہا کیا تجھکو کسی علاج کرنے والی کی ضرورت ہے۔ بیج نے کہا نہیں اس کی بھی ضرورت نہیں۔ کئی راتیں بڑ کے بیج کو اسی تکلیف میں گذریں۔ آخر میں میری قوت نمو سے وہ شق ہوا۔ اس میں سے ایک ننھی سی ہری چیز باہر آئی۔ چھلکے اس بیج کے خاک کے ذرے بنکر میرا جزو بدن ہوگئے۔ اور ایک چھوٹی سی جڑ اس ہری بھری کونپل کی میرے اندر پیدا ہوئی۔ جڑ نے مجھ سے کہا مجھے باہر جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مجھے اپنے اندر رہنے کے لئے جگہ دے۔ میں نے کہا کہ میں تیرا گھر ہوں تو شوق سے پاؤں پھیلا میں اپنے اندر کی گرمی اور اپنے اندر کی تری اور باہر کی حرارت آفتاب اور نمو کی وہ قوتیں

۱۰ ذیقعدہ ۱۳۴۰ھ

جو آکاش اور خلا میں بکھری ہوئی ہیں کھینچ کھینچ کر تجھکو دونگی۔

باہر کی ہری کونپل اپنی جڑ سے بےخبر عظیم الشان سورج عظیم الشان آسمان اور عظیم الشان دنیا کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ میں اس قدر چھوٹی کونپل اور باہر کی چیزیں اتنی بڑی بڑی میں کیا ہوں؟ یہ کیا ہیں؟ میں کیوں ہوں؟ یہ کیوں ہیں؟ میں نے کونپل سے کہا تو بھی خاک! میں بھی خاک! یہ صورتوں کا اُلٹ پھیر ایک ذات مطلق کا تماشہ خانہ ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

پھر تو وہ کونپل بڑھنے لگی۔ میں اُنکی جڑوں کو پانی پلاتی تھی کھانا کھلاتی تھی اور میں ہی اُس کی کونپلوں کے ذریعہ حرارت آفتاب اور خنکی مہتاب جذب کرتی تھی موسم آتے تھے اور جاتے تھے۔ مینہ برستا تھا۔ دھوپ چمکتی تھی۔ چاندنی کھلتی تھی۔ آندھیاں آتی تھیں۔ سردیاں اپنا زور دکھاتی تھیں مگر میری قوت نمو بڑ کے پودے کو سب انقلابات سے بے توجہ اور بے تعلق ہو کر بڑھا رہی تھی۔ یہانتک کہ وہ بڑھ کر ایک عظیم الشان درخت ہو گیا۔

ایک دن سکندر اس درخت کے نیچے تیز گرمی کے موسم میں گھوڑے پر سوار دھوپ سے بچنے کے لئے آکر کھڑا ہوا۔ اور اس کے دل میں یہ بات آئی کہ آج میں دنیا کا سب سے بڑا فاتح ہوں۔ تو بڑ کے درخت نے اپنا ایک پھل اس کے سر پر پھینکا۔ اس پھل میں بہت سے بیج تھے اور ہر بیج میں ایسا ہی ایک ایک عظیم الشان بڑ پوشیدہ تھا۔ جیسے عظیم الشان بڑ کے نیچے سکندر کھڑا تھا۔

یہ بڑ کا پھل اس واسطے اُس کے سر پر گرا تھا کہ سکندر اپنی فتوحات کا گھمنڈ نہ کرے اور اسکو میرا پھل دیکھکر عبرت ہو کہ ایک پھل کے اندر کتنے تخم اور بیج ہیں۔ اور کتنے عظیم الشان بڑ پوشیدہ ہیں۔ مگر مجھے ذرا سا گھمنڈ بھی نہیں ہوتا۔ میرا یہ پھل بے شمار بڑ پیدا کرتا ہے۔ مگر تجھ سے اے سکندر بے شمار سکندر پیدا نہیں ہوتے۔

خاکی آبخورہ

خاک نے بڑ کی داستان اور بیتی بیان کرنی شروع کی تو میں نے کہا یہ قصہ تو نباتات بیتی کا حق ہے تو اپنی حد سے باہر کیوں جاتی ہے تو خاک نے کہا کہ اگر میرے ہی دائرہ اور حد کی باتیں اور حالات چاہتا ہے تو سُن میرا ایک پُتلا تھا اور وہ کسی پُتلی پر عاشق تھا۔ وہ پُتلی اس خاکی پُتلے سے نفرت کرتی تھی

اور پتلا ہجر و فراق کے غم سے رات دن پریشان رہتا تھا جب اس پتلے کو پتلی کے وصال سے قطعی مایوسی ہوگئی تو اس نے اپنے پروردگار کے سامنے ہاتھ اُٹھائے اور رو رو کر کہا۔ کہ اے مولیٰ یا تو پتلی تک مجھے پہنچا اور یا خاکی پنجرے سے میری روح کی مینا کو آزادی دے ذات مطلق نے اس کی دعا سنی۔ اس کے جسم کا خاکی پنجرا کھولا اور اس کی جان کی مینا کو اُڑا دیا۔ خاکی پتلا بے جان ہوا تو کچھ جاندار پتلے جمع ہوئے اور اس کو قبر میں دبا دیا۔ چند ہی روز میں پتلے کا جسم گل سڑ کر خاک ہوگیا۔ قبر کے پاس ایک ندی تھی برسات میں وہ چڑھی۔ اور اس نے عاشق مزاج پتلے کی قبر کو توڑ پھوڑ کر مٹا دیا۔ اور قبر کے پاس ایک بڑا گہرا گڑھا بن گیا۔ جس میں عاشق مزاج پتلے کی خاک بھر گئی۔

سردی کا موسم آیا اور خوب اولے برسے اور اولے ہمیشہ نشیب کی تلاش کرتے ہیں۔ اس لئے وہ پانی کے ساتھ بہے اور اس گڑھے میں جمع ہو گئے، جہاں عاشق مزاج پتلے کے بدن کی خاک کا ڈھیر پڑا تھا۔ اولے بہت زیادہ تھے۔ یہ خاک اولوں کے نیچے کئی دن دبی رہی اور اولوں کا پانی اس گڑھے میں جذب ہوگیا۔ مگر محبت کی آگ عاشق مزاج پتلے کے بدن کی خاک میں اب بھی اتنی ہی جل رہی تھی کہ اولوں کی خنکی نے بھی اس کو ٹھنڈا نہ کیا۔

برتن بنانے والے کمہار ہمیشہ ایسی مٹی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جس پر اولے جمع رہے ہوں۔ قریب کی بستی کے ایک کمہار کو معلوم تھا کہ ندی کے کنارے فلاں گڑھے میں کئی رات دن اولے جمع رہے تھے۔ اس واسطے وہ وہاں آیا اور اس نے مٹی کھودی اور اپنے گھر لے گیا تاکہ اُن کے برتن بنائے اور وہ برتن گرمی کے موسم میں آدمی خریدیں کیونکہ جس مٹی میں اولوں کا پانی مل جاتا ہے اس سے بنے ہوئے برتنوں میں پانی بہت ٹھنڈا رہتا ہے۔ اور گرمی کے موسم میں اولوں کی مٹی کے برتن بڑی بڑی قیمتوں پر خریدے جاتے ہیں۔

کمہار نے اس مٹی کے آبخورے بھی بنائے اور صراحیاں بھی اور اُنکو گرمی اور برسات کے موسم کے لئے اپنے گھر میں رکھ لیا۔

ایک شام کو جبکہ گرمی کی انتہا ہو چکی تھی اور برسات کے موسم کی ابتدا ہی تھی بڑی کالی گھٹا امنڈ کر آئی۔ بادل اس کے ساتھ اپنی گرج کے باجے بجا رہے تھے اور

بجلی اُس گھٹا کے ساتھ اپنی چمک کی مہتابیاں چھوڑتی ہوئی آ رہی تھی بستی کے ایک لاغا پر ایک خاک کی پُتلی اس گھٹا کو کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے دل میں بڑی ستی کے ولولے پیدا ہو رہے تھے۔

یہ پُتلی خاک کی تھی یعنی مجھ سے بنی تھی اور یہ وہی پتلی تھی جس کے ہجر و فراق کے صدمے سے مجھ سے بنا ہوا پتلا مر گیا دب گیا خاک ہو گیا۔ اور پھر اس کی خاک پر اولے پڑے اور پھر اس خاک سے برتن بنے اور کمہار کی کوٹھری میں چپ چاپ پڑے ہوئے تھے۔

اس پتلی نے ابر کو دیکھا موسم کو دیکھا اپنی عمر کو دیکھا اپنی صورت کا خیال کیا اور اپنی امنگوں اور مستیوں سے مجبور ہو کر نوکر کو آواز دی کہ جا۔ جلدی جا اور کمہار کے ہاں ایسے برتن مٹی کے تلاش کر جو اولوں کی آمیزش سے بنے ہوں۔ اور ان برتنوں میں میرے لئے شراب نکال کہ میں آج کی گھٹا اور آج کے بادلوں اور آج کی گرج اور آج کی چمک کا خیر مقدم کرنے کے لئے دو گھونٹ شراب کے پیوں۔

نوکر گیا۔ اسی کمہار کے ہاں پہنچا وہی آبخورے اور صراحی لایا جو اولوں سے بنے تھے جب وہ آبخورے اور صراحی پتلی کے گھر میں داخل ہوئے۔ مرنے والے پتلے کی روح بھی اُن کے ساتھ اس گھر میں آئی اور روح نے اپنے جسم کے خاکی ذرات سے کہا تم اس گھر سے ممنوع تھے تم اس گھر سے مہجور تھے۔ تم کو جیتے جی اس دروازے پر آنے کی اجازت نہ ملی مگر آج تم یہاں آئے ہو تم کو مبارک ہو۔ کہ تم نے اس گھر کو پا لیا جو تمام عمر تمہارا مقصود رہا تھا اور مطلوب و محبوب رہا تھا۔

نوکر نے صراحی کو اور آبخوروں کو دھویا شراب اور پانی صراحی میں بھرا۔ خالی آبخوروں کو اور بھری ہوئی صراحی کو لیکر پتلی کے پاس آیا۔ پتلی نے صراحی اس کے ہاتھ سے لی اور آبخورہ میں شراب انڈیلی پھر مست نگاہوں سے گھٹا کو دیکھا کالے کالے بادل جھوم رہے تھے دوڑ رہے تھے۔ پتلی نے آبخورہ ہاتھ میں اُٹھایا۔ بادلوں کو دیکھتی رہی اور کچھ دل ہی دل میں سوچتی رہی اور آبخورے کو اپنے منہ سے لگا کر شراب کا ایک گھونٹ پیا۔

مرنے والے پتلے کی روح پتلی کے سامنے منڈلا رہی تھی۔ اس نے یہ عالم دیکھا کہ آبخورے کے منہ میں میرے جسم کی مٹی کے وہ ذرے ہیں جو میرے ہونٹوں میں تھے۔ آج

مرنے اور مٹنے کے بعد میرے ہونٹوں کی مٹی اس محبوبہ اور مطلوبہ کے ہونٹوں سے ملی۔ جس نے ان ہونٹوں سے اپنی زبان کے الفاظ ہمیشہ یہی نکالے کہ" وہ مجھ تک نہیں آسکتا۔ وہ مجھ سے نہیں مل سکتا۔ اور میں اس سے کبھی بھی نہ ملوں گی"۔

اس لئے پتلے کی روح نے ذات مطلق سے عرض کیا کہ مجھے زبان دے۔ ایسی زبان جس کو یہ تپلی سمجھ سکے اور سن سکے تاکہ میں اس سے کچھ کہوں۔ اور یہ اس کو سنے۔ ذات مطلق نے اس روح کی دعا قبول کی اور اس کو زبان دیدی۔ تب اس روح نے بزبان اردو یہ شعر پڑھا ؎

پس مردن بنائے جائیں گے ساغر میری گل کے
لب جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

اے مغرور پیکر! اے مخمور تپلی! اے بیہوش مورت آج تیرے ہونٹ جس آبخورے سے ملے ہیں اُس آبخورے کے کنارے جس پر تیرے ہونٹ ہیں اُسی مرنے والے ہونٹوں کی مٹی سے بنے ہیں جس کو تونے جلا جلا کر اپنے ہجر و فراق کی مار سے ستا ستا کر تمام کر دیا تو ملی۔ تیرے ہونٹ ملے مگر مر کر اور خاک میں ملکر۔

تپلی نے یہ آواز سنی اور کہنے والے کو نہ دیکھا تو وہ ڈر گئی۔ اور خوف کی شدت سے اس کے دل کی حرکت بند ہوگئی اور آبخورہ ہاتھ میں لئے ہوئے دنیا سے گذر گئی۔

یہ تو میری خاکی بیتی ہے اس کو تو تو اے حسن نظامی خاک بیتی کے موضوع سے جدا نہیں سمجھتا۔ اگر تو سُنے تو میں تجھکو اپنی بیتی کے ایسے بے شمار قصے اتنی مدت تک سناؤں کہ اس دنیا میں ہزاروں قیامتیں آئیں اور چلی جائیں۔ دنیا بار بار مٹے اور پھر آباد ہو تب بھی مجھ خاک کی بیتی کے افسانے پورے اور ختم نہ ہوں۔

سن میرا قصہ سُن اور اس کو لکھ۔ نجد میں مجھ سے بنی ہوئی ایک مورت کا حال بیان کر جسکا نام قیس تھا اور جس پر عشق و محبت کی تجلیاں نازل ہوتی تھیں اور زمانہ تھا لوگ اس کو مجنوں کہتے تھے وہ مجھ سے بنی ہوئی ایک عورت پر شیفتہ تھا۔ اس عورت کا نام لیلیٰ تھا۔

ایک روز میرا قیس اور تمہارا مجنوں جنگل بیابان میں بیٹھا تھا۔ لیلیٰ کی یاد میں محو تھا اس کے سر پر صاف آسمان کا سایہ تھا اور صاف ریگستان کا فرش اس کے

۱۲ ذیقعد ۱۳۵۵ھ

نیچے تھا اُسے نہ کھانے کا خیال تھا نہ پہننے کا فکر تھا۔ نہ جنگل کی تنہائی کا خوف تھا۔ وہ اگرچہ جنگل میں اکیلا بیٹھا تھا۔ لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ لیلیٰ کا خیال اس کے پاس تھا اور لیلیٰ کی یاد اس کی مونس و رفیق تھی۔

تم نے خیال کیا وہ بیکار بیٹھا تھا اور اپنا وقت کھو رہا تھا وہ بیکار نہ تھا اس نے اپنے وقت کا کوئی حصہ بیکار نہیں کھویا۔ بادشاہ فرمان لکھ رہا تھا۔ وزیر اس فرمان کی تعمیل میں سب اہلکاروں سے کچھ لکھوا رہا تھا۔ حافظ قرآن مجید کی تحریر میں مصروف تھا۔ یہودی توریت لکھ رہا تھا۔ عیسائی انجیل کی نوشت میں مشغول تھا ہنارو ویداور گیتا لکھ رہا تھا۔ قاضی قتل کے فتوے پر دستخط کر رہا تھا۔ شراب فروش شراب کی خرید و فروخت کا حساب درج رجسٹر کر رہا تھا۔ جوئے باز بھی کاغذ سامنے رکھے آمد و خرچ کے حساب میں مصروف تھا۔ جعلساز دغا و فریب کی تحریر میں منہمک نظر آتا تھا بچارے طرف کاغذ پھیلے ہوئے تھے۔ دواتیں رکھی ہوئی تھیں قلم جنبش کر رہے تھے۔ دماغ حکم دے رہے تھے۔ ہاتھ تعمیل کر رہے تھے۔ اور انہوں نے قلم کو گرفتار کر رکھا تھا۔ بچارا قلم خیر اور شر نیک بد کے نوشتے ہاتھ کی حرکت اور دماغ کی حکومت سے لکھ رہا تھا۔ مگر جنگل کا قیس بیابان کا دیوانہ لیلیٰ کا مستانہ مجنوں بھی کچھ لکھ رہا تھا نہ اس کے پاس کاغذ تھا نہ دوات تھی نہ قلم۔ پھر بھی وہ لکھ رہا تھا نہ اس کے پاس قاصد تھا پھر بھی وہ ایک خط کی تحریر میں مصروف تھا۔ سامنے مجھ خاک کے ذرے تھے جنکو مجنوں کی آنکھیں غور سے دیکھ رہی تھیں اور اس کے ہاتھ کی انگلی ذرات ریگ پر کچھ لکیریں کھینچ رہی تھیں وہ کچھ لکھتا تھا اور پھر اپنے ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے نقش کو غور سے دیکھتا تھا۔ روتا تھا ٹھنڈے سانس بھرتا تھا۔ آہ آہ کرتا تھا۔ اور پھر اسی شکل کا اسی صورت کا ایک اور نقش خاک پر بناتا تھا اور پھر اس کی دید میں محو و بیخود ہو جاتا تھا۔

مجھ خاک کا ایک دوسرا تیلا وہاں سے گذرا اور وہ قیس عامری کے پاس کھڑا ہو کر اس کی تحریر کا تماشہ دیکھنے لگا۔ اور دل ہی دل میں کہا واقعی یہ شخص دیوانہ ہے واقعی یہ شخص مجنوں ہے۔ انسان ایسی عبث اور بیکار اور فضول حرکتیں نہیں کیا کرتے۔ یہ تو مٹی پر کچھ نشان بنا رہا ہے اور پھر اس نشان کو دیکھ دیکھ کر رو رہا ہے۔

اس نے پوچھا اے قیس، اے بنی عامر کے نونہال! تو کیا کر رہا ہے۔ قیس نے

اپنے ہاتھ مٹی پر ٹیکے اور بمشکل اپنی گردن کو اوپر اٹھایا۔ اور اس سوال کرنے والے کو دیکھا قیس کو فرصت نہ تھی وہ اس وقت ایک بڑے ضروری مضمون کی تحریر میں مصروف تھا اس کو یہ سوال ناگوار ہوا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بمشکل تمام خاک کی دید سے ہٹایا اور سوال کرنے والے سے کہا کیا کہتے ہو؟ اس نے پھر کہا کیا لکھ رہے ہو۔ اور کس کو لکھ رہے ہو۔؟ قیس نے آسمان کو دیکھا اور ایک لمبا سانس لیا پھر کہا خط لکھ رہا ہوں ریگ کے ذرے کاغذ ہیں اور انگلی قلم ہے۔ یہ خط لیلیٰ کو بھیجنا چاہتا ہوں نہیں! نہیں! میں تو لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں۔ تمہارے بچے تختی پر مشق کرتے ہیں میں اس خاک پر مشق کرتا ہوں۔ مجھکو بڑی محنت در پیش ہے۔ میں لیلیٰ کے نام کو لکھتا ہوں اور پھر کوشش کرتا ہوں کہ یہ نام سلامت رہے مٹ نہ جائے۔ اس میں دو لام ہیں اور دو یے ہیں۔ اس نام میں لیل کا لفظ آتا ہے اور لیل رات کو کہتے ہیں اور رات وہی اچھی ہوتی ہے جس میں فراق ہو، جدائی ہو، ہجر ہو۔ میں مہجور ہوں فراق زدہ ہوں۔ جدا ہوں لیلیٰ سے جدا ہوں۔ نہیں، میں اس کے پاس ہوں وہ میرے پاس ہے۔

تمہارے معشوق تمہارے محبوب تمہارے مطلوب تمہارا نام لکھتے ہیں اور پھر اس نام کو مٹا دیتے ہیں اور تم کہتے ہو۔

لکھکر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا
انکا تو کھیل خاک میں ہمکو ملا دیا

مگر میں اپنے مطلوب اور محبوب کا نام لکھتا ہوں اور اس کو مٹنے سے بچاتا ہوں۔

سائل نے پوچھا کہ یہ نام کیوں لکھتا ہے اس سے تجھے کیا فائدہ؟ مجنوں نے کہا میرے دلکو اس تحریر سے تسلی ہوتی ہے میری آنکھیں یہ لفظ دیکھکر رونا چھوڑ دیتی ہیں۔ اور میری آنکھیں یہ لفظ دیکھکر روتی بھی ہیں اور جب آنسو ان میں آتے ہیں تو وہ ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان آنکھوں میں محبت کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہتی ہے۔

مجنوں خاک لیلیٰ خاک۔ سوال کرنے والا خاک بولنے والی زبان خاک سننے والے کان خاک۔ سب خاک ہی خاک کا افسانہ ہے جو اس کی حقیقت پر غور کرے وہی عاقل ہے اور فرزانہ ہے۔

مجنوں کے باپ نے کہا، بیٹا چل تجھے کعبہ میں لیچلوں۔ کعبہ خدا کا پسندیدہ

مکان ہے۔ وہاں جو دعا کیجاتی ہے قبول ہوتی ہے۔ تو بھی کعبہ کا پردہ پکڑ اور دعا مانگ "
کہ خدا تجھے لیلیٰ کی محبت سے نجات دے۔ جس نے تجھے بدنام کر دیا! رسوا کر دیا! بیمار
بنا دیا! اور زندگی کے ہر کام سے معطل کر دیا۔

مجنوں اپنے باپ کے ساتھ کعبہ کے سامنے آیا اور باپ کے کہنے سے کعبہ کا پردہ پکڑا
اور آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں اور بیتاب ہو کر کہا۔ اے مولا۔ اے مولا۔ اس گھر کے
بنانے والے اس گھر کو چاہنے والے میں تیرے پاس آیا ہوں میں تجھسے فریاد کرتا ہوں میں
تجھسے مانگتا ہوں میں تجھ سے چاہتا ہوں کہ میرے دلکو میرے خیال کو میری آرزو کو
میری تمنا کو میرے جذبات کو میرے خیالات کو لیلیٰ کی محبت سے لیلیٰ کی یاد سے لیلیٰ کے ارمان سے خالی
نہ کر محروم نہ ہونے دے۔ اور مجھے رات دن صبح شام ہر ساعت اور ہر دم اسی خیال میں اور
اسی تصور میں مست اور مگن رکھہ۔

مجنوں کے باپ نے بیٹے کی یہ عجیب اور اُلٹی دعا سُنی تو اس نے مجنوں کے ایک دوہتڑ
مارا اور کہا۔ ارے میں تجھکو کس کام کے لئے لایا تھا اور تو یہاں کیا کام کر رہا ہے۔
میں نے کہا تھا خدا سے یہ دعا کر کہ وہ تیرے دلکو لیلیٰ کی محبت سے آزاد کر دے اور تو یہ
دعا مانگتا ہے۔ کہ خدا تجھکو اس قید میں اور اس قفس میں ہمیشہ مبتلا اور پھنسا رکھے۔

قیس نے جواب دیا۔ اے باپ میں ان لوگوں میں ہوں جو محبت کی زنجیر سے رہا
ہونا نہیں چاہتے اور جو رسوائی اور بدنامی کو ناموری اور نیک نامی سمجھتے ہیں۔ جب وہ دعا
کرتے ہیں تو اس طرح جس طرح میں نے کی اور جب وہ دوسروں سے اپنے لئے دعا کراتے ہیں
تب بھی یہی دعا کراتے ہیں کہ ؎

گر اے زاہد دعائے خیر میگوئی مرا ایں گو
کہ ایں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادہ

بس میں نے جو کچھ مانگا ٹھیک مانگا۔ اور میرے کانوں نے تو یہ سُنا کہ آپ بھی مجھے ایسی
ہی دعا کا حکم دیتے تھے۔

مجنوں کعبہ میں دعا کرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ حرم کعبہ سے باہر نکلا اونٹ پر
سوار ہوا اور اپنے خیمہ میں جانے لگا۔ رستہ میں سینکڑوں خیمے لگے ہوئے تھے جن میں
عربوں کے مختلف قبائل ٹھیرے ہوئے تھے۔ جہاں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں بچے

بھی تھے۔ اور عربوں میں خبر نہیں کتنی لڑکیوں کا نام لیلی تھا۔

جب قیس کا اونٹ ان خیموں کے سامنے سے گذرا تو ایک خیمے سے آواز آئی کہ کوئی شخص اپنی لڑکی کو جسکا نام لیلی تھا یا لیلی! یا لیلی! کہکر پکار رہا ہے۔

مجنوں نے یہ آواز سُنی تو ایک آہ کی اور اونٹ سے نیچے گر پڑا۔ اور اپنی مادری زبان عربی میں اس نے یہ شعر پڑھا ؎

دعا باسم لیلیٰ اسخن اللہ عینہ
ولیلیٰ بارض الاشام فی بلد قفر

اس نے لیلی کا نام لیکر پکارا خدا اس کی آنکھوں کو غمگین کرے۔ لیلی یہاں کہاں ہے وہ تو ملک شام کے کسی شہر میں ہے۔ یہ شعر پڑھتے پڑھتے مجنوں بیہوش ہوگیا۔

اے انسان مجنوں کا باپ میں ہوں، اور مجنوں بھی میں ہوں۔ اونٹ پر بھی میں بیٹھی اور اونٹ سے گری بھی میں اور یا لیلی کہکر آواز بھی میں نے بلند کی اور جس خاک پر مجنوں گرا لوٹا تڑپا وہ بھی میں ہی تھی۔ اور میری بیتی کے ایسے ہی بے شمار افسانے ہیں۔

اندھیری رات جنگل بیابان چاند چھپا ہوا تارے نکلے ہوئے۔ درختوں کا نام ونشان نہیں جدھر نظر جاتی تھی ہو حق کا میدان دکھائی دیتا تھا۔ مجنوں اس خاموش صحرا میں اور اس اندھیری رات میں تاروں کی روشنی میں مجھ خاک پر بیٹھا تھا اور رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ اے خدا۔ اے خالق! تونے مجھے محبت کا دیوانہ کیوں بنا دیا؟ اے خدا! تونے میرے دل میں لیلی کی الفت کیوں بھر دی؟ اے خدا! تونے میرا نام مجنوں مشہور کرا دیا۔ میری گھر گھر رسوائی ہو رہی ہے میری جگہ جگہ انگشت نمائی ہو رہی ہے۔ میں تباہ ہوگیا۔ میں برباد ہوگیا۔ مجھے بھوک نہیں لگتی مجھے پیاس نہیں لگتی مجھے نیند نہیں آتی۔

کباب سیخ ہوں میں کروٹیں ہر سو بدلتا ہوں
جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتا ہوں

مجھے بتا کہ تونے میری یہ حالت کیوں بنائی ہے اور مجھکو اس آفت اور مصیبت میں کیوں پھنسایا ہے۔

جب وہ یہ کہہ رہا تھا اس سنسان جنگل میں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ یکایک ہاتف کی آواز مجنوں کے کان میں آئی اور مجنوں نے سُنا کہ کوئی کہتا ہے کہ اے میرے مجنوں میں نے یہ محبت اور یہ عشق اپنے لئے رکھا تھا۔ میں جس پر مہربان ہوتا ہوں اسی کو اپنے حصہ میں سے

کچھ دیدیتا ہوں۔ تجھ پر میری نوازش تھی عنایت تھی مہربانی تھی کہ لیلیٰ کا عشق تجھکو دیا۔ دیوانے لیلیٰ کہاں ہے وہ تو میں ہوں لیلیٰ کی زلف میں میں ہوں لیلیٰ کی آنکھہ میں میں ہوں۔ لیلیٰ کے رخسار میں میرا ہی حسن ہے۔ لیلیٰ کے چہرۂ زیبا میں میری ہی دلربائیاں ہیں لیلیٰ کی گفتار میں جب اُسکی شیریں نوائی تجھکو مبہوت کر دیتی ہے میں ہی ہوتا ہوں۔ اور لیلیٰ کی رفتار میں جس کو دیکھکر تجھپر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے میں ہی پوشیدہ ہوتا ہوں۔

تو پوچھتا ہے میں نے تجھے یہ محبت کیوں دی۔ میں بتاتا ہوں مجھے محبت پیاری ہے اور جس سے مجھے تعلق ہوتا ہے میں اسی کو اپنی پیاری محبت کا حصہ دیتا ہوں۔ اے مجنون جب تو اس جنگل بیابان میں اس سنسان میدان میں فرش خاک پر بیٹھا ہوا کہتا ہے۔ لیلیٰ! لیلیٰ! تو مجھے خوشی ہوتی ہے اور جب تو ہائے لیلیٰ! ہائے لیلیٰ!! کی صدا لگاتا ہے تو مجھے بڑا ہی لطف آتا ہے اور جب تو اپنے کلیجے کو تھام کر بیتاب اور بے قرار ہوکر آسمان کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے یارب! یا اللہ! ہائے! ہائے!! تو مجھے تیرے یارب اور یا اللہ اور ہائے ہائے کہنے میں بہت کیفیت آتی ہے۔ اور میں اس سے خاص ذوق رکھتا ہوں۔

اے انسان! دیکھ اور سن اور سمجھ یہ مجھ خاک کی بپتی ہے۔ مجنوں مجھ ہی سے بنا تھا۔ یا لیلیٰ اور ہائے لیلیٰ میری ہی خاکی زبان سے کہتا تھا۔ اور میں ہی وہ خاک ہوں جس کو ہاتف نے اس جنگل بیابان میں یہ پیغام سنایا تھا کہ میں نے اپنی پیاری محبت کا حصہ تجھے دیا اور تیری ہائے ہائے سے مجھے لطف آتا ہے۔

رادھا ہندوستان کے مشہور شہر متھرا کے جنگل میں ایک من موہن سندر چندر روپی کرشن کنہیا کی یاد میں کھڑی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی ؎

شام نے مرلی بجائی کس طرح ۔۔۔ مچ گئی گھر گھر دہائی کس طرح

ہر کی مرلی ہر کے اندر باجتی ۔۔۔ ہر کی ہے ہر سے رسائی کس طرح

میں عورت ہوں خاک سے بنی ہوئی۔ بن کی سوکھی لکڑی ہوں۔ پریم کی آگ سے جلی ہوئی۔ میرے شیام سندر کی بانسری بانس کی ہے۔ اس کا کلیجہ بھی اندر سے خالی ہے میرا شیام سندر جب اپنے ہونٹ اس خالی کلیجے کے بانس پر رکھتا ہے اور اس میں کچھ پھونکتا ہے تو وہ خالی بانس بولنے لگتا ہے۔ اس میں سے سُر پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں سے لے نکلتی ہے

۲۰ ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ

اور وہ لے چرند اور پرند کو وجد میں لے آتی ہے۔ میرا کلیجہ بھی محبت کی آگ نے جلا ڈالا۔ میں بھی بانسری کی طرح اندر سے خالی ہوں۔ مجھے بھی اپنے شیام سندر کرشن کنہیا کے ہونٹوں کی طلب ہے تاکہ میرے اندر سے بھی سُر پیدا ہوں اور میرے اندر بھی لے نمودار ہو اور میرے اندر سے بھی نغمۂ حق کی کیفیات نمودار ہوں۔

میں عورت ہوں۔ استری ہوں۔ خاک کا بنا ہوا پتلا ہوں مٹی سے ڈھلی ہوئی مورت ہوں۔ میں رادہا ہوں۔ عورت ہوں۔ میں رادہا ہوں ماں باپ کی بیٹی۔ میں رادہا ہوں۔ بھائیوں کی بہن۔ میں رادہا ہوں اپنے شیام سندر کی اپنے کرشن کنہیا کی اپنے گوپال کی۔ اپنے گئو چرانے والے کی اپنے بانسری بجانے والے کی جس کا رنگ سانولا ہے مگر سلونا ہے جس کی آنکھیں رسیلی ہیں نٹ کھٹیلی ہیں۔ جس کی آواز میں مستی ہے مگر ہوشیاری ہے جو چلتا پھرتا ہے مگر میرے من میں ہر وقت بیٹھا ہی رہتا ہے جو بولتا چالتا ہے مگر میرے کان ہر وقت اسکو چپ چاپ سنتے ہیں۔ سب لوگ کانوں سے آواز سنا کرتے ہیں میں اپنے کانوں سے خاموشی سنتی ہوں۔ سب لوگ اپنی آنکھوں سے رنگا رنگی دیکھتے ہیں۔ لیکن میں صرف ایک ہی روپ دیکھتی ہوں۔ سانولا سانولا۔ سلونا سلونا۔ وہ رنگیلا ہے وہ ہٹیلا ہے۔ وہ ہریالا ہے وہ متوالا ہے جوبن والا ہے۔ اور میں اسی کی رادہا ہوں۔

میں کہتی ہوں وہ میرا ہے۔ گوپیوں کی آواز آتی ہے وہ تو ہمارا ہے میں اس کو اپنا کہوں یا نہ کہوں؟ میرا من تو یہی کہتا ہے کہ وہ میرا ہی ہے۔ رادہا شام ہے اور شام رادھا ہے۔ میں وہ ہوں اور وہ رادہا ہے

من او شدم او من شدہ من جاں شدم او تن شدہ

میں رادہا بنی وہ شام بنا۔ میں جان ہوئی اس کے تن میں سمائی وہ جان بنا میرے رونگ رونگ میں بس گیا۔ میں اس سے بولتی ہوں۔ میں اس سے سنتی ہوں اس سے دیکھتی ہوں میری زبان وہی ہے میرے کان وہی ہے۔ میری آنکھ میں وہی ہے۔

اور میرے شام سندر کرشن کنہیا کے کان میں رادہا ہے۔ آنکھ میں رادہا ہے زبان پر رادہا ہے۔ جب وہ بانسری بجاتا ہے تو رادہا کا گیت سنا جاتا ہے۔ سورج رادہا شام رادہا شام کہکر چمکتا ہے اپنی دہوپ برساتا ہے چاند منم رادہا منم شام منم! منم منم! تنم تنم! کہکر اپنا مکھڑا دکھاتا ہے۔ تاروں کی جوت میں رادہا دکتی ہے۔ جمنا کے ریت میں رادہا کی جوت چمکتی ہے

میں نہیں ہوں یہ تو خاک ہے۔ یہ تو مٹی ہے۔ میں بھی مٹی ہوں۔ شیام سندر بھی مٹی سے بنا ہوا اور اس کی بانسری بھی مٹی سے نکلی ہوئی اور اس کی گوپیاں بھی مٹی سے بنی ہوئی۔ ہندوستان میں "رادھے شام رادھے شام" کی دھوم ہے۔ مگر ہر لفظ اور ہر بات میں خاک کی گیتا اور خاک کی بتیا مرقوم ہے۔

چپ چاپ جنگل گنجان درخت آدمیوں سے خالی حیوانوں سے بھرپور۔ ایک طرف پہاڑ ایک طرف سمندر۔ مگر تین خاک کی مورتیں بشر کی صورتیں وہاں موجود ہیں۔ ایک کا نام رام ہے دوسرا لچھمن ہے۔ تیسری سیتا ہے۔ سیتا رامچندر جی کی بیوی دکھ کی ساتھی بن باس کی رفیق اپنے پتی کی ستونتی یونس زندگی بنی ہوئی جنگل بیابان میں بیٹھی ہے۔ رام لچھمن شکار کو گئے ہیں۔ جنگل کے درخت اس نیک اور زندگی کی جفا سہنے والی عورت کی پاسبانی کر رہے ہیں یکایک راون آیا اور سیتا کو اٹھا کر لے گیا۔ رام لچھمن شکار سے آئے۔ سیتا کو اپنی جگہ پر نہ دیکھا تو گھبرا گئے۔ پریشان ہو گئے۔ انہوں نے جب سب جگہ ڈھونڈھ لیا تو پتھروں سے پوچھا سیتا کہاں ہے۔ درختوں سے پوچھا سیتا کہاں ہے اور مجھ خاک سے پوچھا سیتا کہاں ہے میں جانتی تھی سیتا جہاں ہے مگر میں نے نہ کہا سیتا وہاں ہے۔ مجھے تو ایک تماشا دیکھنا تھا میں تو چھتری دھرم کی جنگ دیکھنی چاہتی تھی اور وہ دیکھی۔ مجھے تو سیتا کی پتی برتا اور پتی بھگتی کا امتحان کرنا تھا اور وہ میں نے کیا۔ میں نے راون کے گھر میں سیتا کو غمگین دیکھا۔ سیتا کو اداس دیکھا اور سیتا کو روتا ہوا بھی پایا۔ سیتا سر جھکائے کسی خیال میں مدہوش و بے خبر بیٹھی رہتی تھی۔ سیتا نے راون کے تاج و تخت اور راون کی شان و شوکت اور راون کے مال و دولت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کو اپنے تارک دنیا پردیسی جنگل میں ڈانواں ڈول پھرنے والے بالم کی یاد دنیا کی ہر عزت اور ہر شوکت اور ہر برتری سے اعلیٰ معلوم ہوتی تھی۔ آخر وہ رام سے ملی۔ راون مغلوب ہوا۔ رام نے لنکا کو جیت لیا اور جب وہ کمان کندھے پر ڈالے ترکش سنبھالے اپنی سیتا کے سامنے آیا تو فراق اور ہجر لرز کر کانپ کر دور ہٹ گئے رام کی آنکھوں نے سیتا کو دیکھا اور سیتا کی جھکی ہوئی نظروں اور دھڑکتے ہوئے دل نے اپنے اندر کے آئینہ میں رام کی موہنی صورت پائی اور اس کو سیتا نے اسی بھرپور پریم سے دیکھا جس طرح ایک راجپوتنی کو اپنے پتی اور اپنے شوہر کو دیکھنا چاہیئے۔

اجودھیا میں جب یہ دونوں چاند چکور پہنچے اور تاج و تخت کے مالک ہوئے

تو ایک دھوبی کی بات سے رام کو سیتا پر شبہہ ہوا۔ اور اس شبہہ سے سیتا نے دُکھ اُٹھایا وہ دُکھ بہت بڑا تھا۔ گھربار چھوڑنے کا دکھ اس دُکھ سے کم تھا۔ برسوں جنگل میں بے یار و مددگار اور بے گھر اور بے در رہنے کے دکھ سے بھی بڑا تھا۔ اور رام سے جدا ہو کر راون کی قید میں بند رہنے کے دُکھ سے بھی بڑا تھا۔ وہ ہر دُکھ سے بڑا دکھ تھا۔ اس دکھ کی برابر دنیا میں کوئی دُکھ بھی نہ تھا۔

رام کے سب دُکھ دیکھنے والی میں تھی رام کے سب سکھ دیکھنے والی میں تھی۔ سیتا کے سب سکھ دیکھنے والی میں تھی اور سیتا کے سب دکھ دیکھنے والی بھی میں تھی۔ میں نے سیتا اور رام کی مورتوں میں سب کچھ دیکھا دکھ بھی سکھ بھی۔ میں نے سیتا اور رام کی مورتوں میں سب کچھ سُنا اچھا بھی برا بھی۔ میں ہی رام تھی اور میں ہی سیتا۔ میں ہی لچھمن تھی اور میں ہی تیر کمان اور میں ہی وہ رانی تھی جس نے سیتا اور رام اور لچھمن کو جنگل میں نکلوایا اور تاج و تخت سے محروم کرایا۔ میں ہی رام کو سبق پڑھانیوالی واشسٹ تھی۔ میں نے ہی کتاب یوگ واشسٹ لکھی تھی اور میں ہی راون تھی جس نے سیتا کو ہرایا اور سیتا کو چرایا۔ اور میں ہی ہنومان تھی۔ رام کی فوج کا سپہ سالار۔ میں نے ہی لنکا پر جانے کے لئے سمندر پر پل بنایا اور میں ہی لنکا کو جلانے ہنومان کی صورت میں گئی اور مجھی کو راون کی صورت میں رام نے قتل کیا۔ راون میں میں خاک تھی۔ رام میں بھی خاک تھی مگر صاف تھی اور پاک تھی اور سیتا میں بھی میں ہی تھی اور جب سیتا نے رام کے طعنہ سے دکھ اُٹھایا اور مجھ خاک کو پکارا کہ لے دھرتی ماتا تو مجھے اپنے اندر جگہ دے کہ میں رام کے شبہہ کا دُکھ نہیں اُٹھا سکتی تو میں نے اپنی لاڈلی کو اپنی مورت کو اور اپنی صورت کو اپنے اندر جگہ دی۔ میں شق ہو گئی اور سیتا میری سیتا میرے اندر زندہ سما گئی اور اپنی پاکبازی کا سکہ رام کے اور ان سب کے جو عورتوں اور بے گناہ عورتوں پر شبہہ کی نظر ڈالتے ہیں دلوں پر چلا گئی۔

دیکھو۔ دیکھو! سنو۔ سنو!! یہ سب مجھی خاک کی سرگذشت ہے۔ یہ سب میرے ہی افسانے ہیں۔ مگر خاک کے بنے ہوئے آدمی اس قدر دیوانے ہیں کہ مجھکو بھولجاتے ہیں اور ہما ہمی کے نعرے لگاتے ہیں نہ سوچیں تو جانیں کہ ہم بھی میں خاک ہوں اور ہما بھی میں خاک ہوں اور ہمی بھی میں خاک ہوں۔ میرے سوا نہ ہم ہے نہ ہما ہے نہ ہمی ہے۔

میرا نام رانجھا ہے۔ میں ایک عورت کا عاشق ہوں جس کا نام ہیر ہے۔ ہم پنجاب کے شہر جھنگ میں ہیں۔ میں رانجھا ہزارہ کا رہنے والا ہوں اور ہیر کی یاد مجھکو

۲۰ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ

جھنگ میں لائی ہے۔

میں بھینیں چراتا ہوں اور ہیر بھی گائے بھینس کی مالک ہے نہ وہ تعلیم یافتہ ہے نہ میں پڑھا لکھا ہوں نہ اس کو محبت کا علم کسی نے پڑھایا نہ میں نے عشق کا درس کسی مکتب میں پڑھا ہے۔

محبت بے پڑھے آتی ہے بے سکھائے انسان اس کو سیکھہ جاتا ہے۔ محبت امیر غریب کی پابند نہیں ہے ادنیٰ اعلیٰ کی پروا نہیں کرتی۔ کالے، گورے، خوبصورت، بدصورت احمق اور عقلمند کی تخصیص محبت کے گھرانے میں نہیں ہوتی وہ تو جہاں چاہتی ہے چلی جاتی ہے جس کو چاہتی ہے اپنا شکار بنا لیتی ہے۔ گورا ہو یا کالا ادنیٰ ہو یا اعلیٰ امیر ہو یا غریب جاہل ہو یا عالم عاقل ہو یا بے وقوف۔ محبت کو اس سے کچھ سروکار نہیں اس کی نظر ہر جگہ پہنچ جاتی ہے وہ ہر ایک کو بلا کسی شرط اور خصوصیت کے شکار کر لیتی ہے۔

میں رانجھا گاؤں کا رہنے والا گنوار۔ نہ کھانا جانوں نہ پہننا جانوں نہ رہنے کی تمیز نہ بولنے کا سلیقہ، مگر محبت نے میرے بھی تیر مار دیا۔ میرا کلیجہ بھی اس کی برچھی سے زخمی ہو گیا۔ مجھکو بھی اس کی کمند نے گرفتار کر لیا۔ میں ٹھوکریں کھاتا ہوا گھر سے چلا۔ میں نے دریاؤں کو عبور کیا میں نے گرم دھوپ کو سر پر لیا۔ میں نے ہر تکلیف اور ہر رنج کو بھلا دیا۔ اور میں ہیر کے گھر تک آگیا۔ ہیر میرا ہیرا ہے۔ ہیر میرا موتی ہے۔ ہیر کھری چارپائی پر سوتی ہے نہ اس کے لئے سنہری روپہلی چھپر کھٹ ہے نہ پھولوں کی سیجیں ہیں نہ اس کے ہاتھ میں مہندی ہے نہ اس کے منہ میں پان ہے نہ اس کے ہونٹوں پر لاکھا ہے۔ نہ اس کی آنکھوں میں سرمہ ہے نہ وہ پھولوں کی ٹہنی کی طرح دبلی پتلی لچکدار ہے وہ تو ایک گاؤں میں رہتی ہے اس کا مکان کچا ہے جس پر پھوس کا چھپر ہے اس میں ایک بڑا اونچا اور بڑا چوڑا چکلا اور بہت ہی بدشکل پلنگ بچھا ہوا ہے۔ ہیر اس پلنگ پر سوتی ہے۔ نہ اس پر تکیہ ہوتا ہے نہ بچھونا۔

ہیر خوب مضبوط جسم کی ایک لڑکی ہے پنجابی لہنگا پہنے ہوئے بڑی بڑی آنکھیں خوب چوڑا آفتابی چہرا مضبوط بھرا ہوا جسم۔ اس کی انگلیاں لیلیٰ کی انگلیوں کی طرح پتلی پتلی نازک نہیں ہیں بلکہ پتھر کی طرح سخت اور نہایت کھردری ہیں۔ کیونکہ وہ بھینسوں کے لئے کٹی کاٹتی ہے۔ دودھ بلوتی ہے۔ گوبر تھاپتی ہے اور رات دن سخت سے سخت

کاموں میں مصروف رہتی ہے اس کو کسی نے نہیں بتایا تھا کہ اس دنیا میں عشق بازی بھی ایک علم ہے مگر رانجھا اس پر عاشق ہوا اور ہیر نے بغیر کسی کے بتائے سمجھ لیا کہ انسان کو محبت سے بھی سابقہ پڑا کرتا ہے۔

رانجھا اپنی محبت کے طوفان میں پڑا ہوا غوطے کھاتا رہا اور ہیر کی شادی کسی دوسرے آدمی سے ہوگئی۔ جب ہیر کا ڈولا اونٹ پر لادا گیا اور ہیر کا غیر مستحق خاوند ہیر کو اپنے گھر لیچلا تو مایوس رانجھا سرِ راہ ایک درخت سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ دن تھا سورج چمک رہا تھا مگر رانجھے کو دنیا اندھیری نظر آتی تھی۔ اس کو دنیا کی کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ فرقت کے غم کو جنبش کے ساتھ ظاہر کرنا نہ جانتا تھا۔ اس کو کسی شاعر کا شعر بھی یاد نہ تھا وہ تو کسی اندرونی اور کسی چھپی ہوئی چیز سے بے قابو ہوکر پردیس میں آیا تھا اور آج جبکہ ایک غیر سے ہیر کی شادی ہوئی تھی اور ہیر اس غیر کے ساتھ رانجھے سے جدا ہوکر اپنی سسرال کو جارہی تھی۔ رانجھا اس کے راستے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کا دل تڑپ رہا تھا اس کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا اس کے آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے وہ اسی طرح روتا تھا جس طرح تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل عاشق روتے ہیں۔ وہ اُسی طرح آہ آہ کر رہا تھا جس طرح پیشہ ور عشاق کو ہائے اور اُف کرنی چاہیئے۔

رانجھے کا چہرہ زرد تھا۔ رانجھے کی آنکھیں سُرخ تھیں اور اُن میں آنسو تھے۔ رانجھے کے ہونٹ رونے کی شدت سے کپ کپا رہے تھے۔ رانجھے نے اپنی پیٹھ درخت سے لگا رکھی تھی اور دونوں ہاتھ اپنی پیٹھ کی طرف موڑ کر درخت کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ درخت سے گردن لٹکائے راستہ کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اب اس کی ہیر محمل میں بیٹھی ہوئی آتی ہوگی اور میں اس کا آخری نظارہ یہاں کروں گا۔

یکایک برات آئی اور ہیر کا اونٹ بھی سامنے آیا۔ رانجھے نے چاہا کہ وہ آگے بڑھے۔ ہیر کو پکارے اور اپنے درد غم کو ظاہر کرے مگر محبت نے اس کے پاؤں کو ہلنے نہ دیا۔ اس کے جسم کی طاقت نے جواب دیدیا اور وہ درخت سے جدا ہوکر ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ مگر اس کے اندر ایک پوشیدہ طاقت تھی۔ جس نے ہیر کے اونٹ کو روک لیا اور اس کے اندر ایک مخفی زبان تھی جس نے جسم کی زبان کو بند کر کے ہیر کو پکارا کہ ہیر او ہیر میں تیرا رانجھا یہاں کھڑا ہوں تو غیر کے یہاں جاتی ہے مجھے

آخری دیدار دکھاتی جا۔ اب تو مجھے کبھی نہ دیکھے گی۔ کیونکہ میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں

ہیر نے کسی غیبی اثر کے ذریعہ رانجھے کی اس باطنی آواز کو سنا اور اس نے اپنے ڈولے کا پردہ ہٹا کر رانجھے کو دیکھا۔ رانجھے نے بھی ہیر سے نظریں ملائیں اور ان نگاہوں نے زبان عشق میں باتیں شروع کیں۔ عشق کی زبان کتب میں نہیں پڑھائی جاتی۔ عشق کی زبان ماں باپ بچوں کو نہیں سکھا سکتے۔ عشق کی زبان اسکولوں اور کالجوں میں اور موٹی موٹی کتابوں میں نہیں ہوتی۔ عشق کی زبان تو ہر عاشق معشوق کو خود بخود آجاتی ہے اور عشق کی زبان گریمر اور صرف و نحو اور قواعد سے بالکل آزاد ہوتی ہے۔

اس عشق کی زبان میں ہیر نے کہا پیارے رانجھے میں جاتی ہوں۔ میرے دلفگار میں اپنے اختیار سے نہیں جاتی یہ لوگ مجھے مجبور کر لئے جاتے ہیں تو دل کو سنبھال۔ رنج و غم کو چھوڑ اور صبر کر کہ اب میں تجھ سے جدا ہوتی ہوں۔ بظاہر دوسروں کا قبضہ ہی مگر میں درحقیقت تیرے قبضہ میں ہوں۔ میں تجھ سے جدا ہو کر جا رہی ہوں۔ مگر اصل میں تیرے ہی پاس آرہی ہوں۔

رانجھے نے بھی عشق کی زبان میں جواب دیا۔ میں تیرا ہوں تجھکو میرا ہونا چاہیئے تھا تو کہاں چلی اب میں کہاں جاؤں۔ دیس چھوڑا پردیسی بنا۔ رسوا ہوا۔ تباہ ہوا برباد ہوا مگر افسوس تو ہی ہاتھ نہ آئی۔

میں خاک ہوں رانجھا میں ہوں۔ میں خاک ہوں۔ ہیر میں ہوں۔ میں خاک ہوں۔ ہیر کو رانجھے سے جدا کر کے لیجا نیوالی بھی میں ہی ہوں۔ ہیر رانجھے کا قصہ سب پڑھتے ہیں اور اپنے عشق کو گرم کرتے ہیں۔ لیکن مجھ خاک سے سب کو بیخبری ہی اگر رانجھے سے لوگوں کو ہمدردی ہے تو وہ ہمدردی مجھ خاک سے ہونی چاہیئے اگر ہیر سے لوگوں کو محبت ہے تو مجھ خاک سے ہونی چاہیئے اور اگر ہیر کے وارثوں سے لوگوں کو نفرت ہے۔ جنہوں نے ہیر کی شادی غیر سے کردی اور اس غیر سے عداوت ہی جو ہیر کو رانجھے سے جدا کر کے اپنے گھر لے چلا تو وہ نفرت اور عداوت بھی مجھ خاک سے ہونی چاہیئے۔

اہاہا! مجھ خاک کی داستان میں کیسے کیسے بھید پوشیدہ ہیں۔ مگر جو جانتے ہیں وہ کہتے نہیں اور جو کہتے ہیں وہ جانتے نہیں۔

ذات پاک نے پہلے پانی کو بنایا پھر ہوا آگ اور مجھ خاک کو پیدا کیا۔ نور

بھی نمودار ہوا۔ نور سے فرشتے بنائے۔ آگ سے شیاطین پیدا ہوئے۔

میں اس وقت چپ چاپ تھی۔ مجھ سے کوئی چیز نہ بنی تھی۔ مجھ پر پانی بھرا ہوا تھا اور وہ اُچھلتا تھا موجیں مارتا تھا۔ لہریں لیتا تھا۔ اور اُن لہروں اور موجوں میں ایک نور کروٹیں لیتا تھا۔ اس نور کی پیشانی پر ایک اور برگزیدہ نور چمک رہا تھا۔ میں پانی کی تہہ میں دبی ہوئی پانی کی سطح کے نور کو دیکھتی تھی اور پھر اس نور کی پیشانی پر ایک اور جگمگاتے ہوئے نور کو دیکھکر حیران ہوتی تھی۔ مجھ سے کہا گیا تھا یہ نور محمدی ہے اور آخر تجھ خاک کے چہرہ پر یہ نور جلوہ افروز ہونے والا ہے۔

روز کہتی تھی۔ روز سوچتی تھی۔ مجھ میں روز تمنائیں۔ آرزوئیں اور ارمان پیدا ہوتے تھے کہ یہ کیونکر ہوگا اور یہ کب ہوگا۔

یکا یک ذات پاک نے فرشتوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ میں خاک کے اوپر خاک سے بنا ہوا اپنا ایک خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے سنا کہ خاک کی قسمت جاگنے والی ہے۔ ذات پاک کا خلیفہ مٹی سے نمودار ہونے والا ہے تو اُنکو حسد ہوا رشک ہوا اور اُنہوں نے ذات پاک سے عرض کیا۔ لوح محفوظ میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خاکی خلیفہ زمین پر بڑی خونریزی کرے گا اور ہم تیری حمد وثنا کرتے ہیں۔ تیرے نام کی سمرن جپتے ہیں اور تونے ہمکو نور سے پیدا کیا ہے۔ ذات پاک نے مجھ خاک سے ایک پتلا بنایا تھا اور اس کا نام آدم رکھا تھا وہ پتلا بے جان میرے سینہ پر پڑا تھا ذات پاک نے فرشتوں کی شکایت سُنی تو اس پتلے سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ اُٹھ خاک کی مورت اُٹھ کھڑی ہو۔ آدم میں جان آگئی وہ مورت کلمہ پڑھتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ ذات پاک نے فرمایا۔ دیکھ تیرے سامنے یہ کیا ہے۔ اس وقت کُن سے نمودار ہونے والی کائنات کی تمام اشیاء سامنے موجود تھیں۔ آدم نے ہر ایک کا نام لینا شروع کیا۔ یہ پہاڑ ہیں۔ یہ پانی ہے۔ یہ درخت ہیں۔ یہ جانور ہیں۔ یہ میوے ہیں۔ یہ خشک ہے یہ تر ہے۔

پہلے یہی سوال ذات پاک نے فرشتوں سے بھی کیا تھا اور جب وہ جواب نہ دے سکے تو آدم سے پوچھا گیا۔ آدم نے اشیاء کے نام بتائے۔ حقیقت نہ بتا سکا اور بتاتا کیونکر۔ حقیقت اس کو معلوم ہی کہاں تھی۔ نام بھی کسی اور نے بتائے تھے

بہانہ آدم کی شکل کا تھا۔ بولنے والا اور بتانے والا تو کوئی اور ہی تھا۔

جب آدم نے اشیاء کے نام بتا دئے تو فرشتے حیران اور لاجواب ہو گئے اور انکو ماننا پڑا کہ یہ خاکی تپلا ہی اس قابل ہے کہ ذات پاک اس کو زمین پر اپنا خلیفہ بنائے۔

آگ کا بنا ہوا شیطان دور کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس کو فرشتوں کی ناکامی اور آدم کی کامیابی کا بڑا افسوس ہوا اور جب اس نے خاکی پتلے کو بولتا ہوا دیکھا اور خاکی پتلے کے بول کو اور اُلجھی ہوئی نامعلوم حقیقت کو کھولتے ہوئے پایا تو شیطان اپنے دل ہی دل میں کھولنے لگا۔ اور آدم کی دشمنی کے منصوبے سوچنے لگا۔

ذات پاک کو فرشتوں اور شیاطین کا امتحان لینا تھا۔ حکم ہوا۔ اے فرشتو۔ آدم کو سجدہ کرو۔ فرشتوں نے آدم کو دیکھا اور اس کی پیشانی پر ایک چمکتا ہوا نور بھی دیکھا وہ سب کے سب اس نور کو دیکھکر اور ذات پاک کے حکم کو سُنکر سجدہ میں گر پڑے ذات پاک اپنے حکم کی اس تعمیل سے بہت خوش ہوئی۔ مگر شیطان نے آدم کو سجدہ نہ کیا۔ وہ گھمنڈ میں غرور میں خودپسندی میں سرشار اور چپ چاپ کھڑا رہا۔ ذات پاک نے اسکو خاموش دیکھکر دریافت فرمایا۔ اے ابلیس! تو نے سجدہ کیوں نہ کیا۔ ابلیس نے کہا۔ میں آدم سے بہتر ہوں۔ میں آدم سے اعلیٰ ہوں۔ میں آدم سے برتر ہوں۔ مجھکو تو نے آگ سے بنایا اور آدم کو خاک سے نکالا۔ آگ کا شعلہ آگ کا تپلا تو دہ خاک اور مٹی کے کھلونے کے سامنے کیونکر جھکتا۔

ذات پاک کو ابلیس کی یہ بات اچھی نہ معلوم ہوئی اور اس نے ابلیس کو ازل سے ابد تک کے لئے ملعون و مردود قرار دے دیا۔

یہ پہلی گھڑی تھی کہ آگ نے مجھ خاک سے دشمنی کی۔ اور یہ پہلا وقت تھا کہ ذات پاک نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرایا۔ گویا نور کو کثیف خاک کے سامنے جھکنا پڑا اور یہ پہلا موقع تھا جو آتشی تپلے نے ذات پاک کے حکم سے سرکشی کی اور راندۂ درگاہ ہوا۔

آدمؑ کے مردانہ پتلے کو حواؑ کی زنانہ تپلی بھی ملی اور یہ دونوں ذات پاک کی بہشت میں رہنے لگے۔ ذات پاک نے آدمؑ سے کہا۔ شیطان سے بچتا رہیو وہ تیرا اور تیری اولاد کا

دشمن ہے۔ پھر ایک درخت کو دکھایا کہ اس کا پھل نہ کھائیو بلکہ اس کے پاس بھی نہ جائیو۔ ورنہ خطا پائیگا اور تمام عمر پچھتائیگا۔

آدم سے بھول ہوئی اس نے ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا۔ اس کو ابلیس نے بہکایا۔ ابلیس اُس کے اندر تھا یا باہر تھا۔ ابلیس نے آدم کے دل کو بہکایا یا کان کے ذریعہ دماغ کو بہکایا۔ اس میں تو کیوں الجھتا ہے مطلب صرف اتنا ہے کہ آدم اور حوا دونوں بہک گئے اور ذات پاک کی جنت سے نکالے گئے۔

اُسدن سے آدم اور اس کی اولاد زمین پر آباد ہوئی اور شیطان کی مخالفت کا روزانہ سابقہ پڑنے لگا۔

اُوپر مجھہ خاک کی غیر مسلسل بیتی تھی اب میں ایک قاعدہ اور ایک ترتیب کے ساتھ اپنی بیتی بیان کر رہی ہوں۔ آدم کب تھا۔ اس کی ابتدا کو کتنا عرصہ ہوا۔ یہ بحث فضول ہے کہ ازل اور ابد کے اوقات کا مقرر کرنا محال ہے اور مفید بھی نہیں۔ آدم جب بھی ہوا ہو کہنا یہ ہے کہ وہ خود نہ تھا۔ میں تھی۔ میں خود نہ تھی۔ وہ تھا۔

ہم دونوں نہ تھے۔ ایک نور تھا جو آدم کی پیشانی میں جھلک رہا تھا۔

فرشتے جس خاک کی صورت کے آگے جھکائے گئے وہ خاک نہ تھی۔ سجدہ خاک کو نہ کرایا گیا تھا۔ اُس تو وہ خاک میں ذات پاک کا نور رکھا گیا تھا۔ مجھے تو فخر اس پر ہے کہ وہ نور آگ کو نہ ملا۔ پانی کو نہ ملا۔ ہوا کو نہ ملا۔ نوری فرشتوں کو بھی نہ ملا۔ عرش و کرسی کو نہ ملا اور ملا تو کس کو ملا۔ جو سب سے زیادہ حقیر اور پامال مٹی کہی جاتی ہے۔ یہ میری بیتی کی ابتدا تھی۔

آدم کے دو بیٹے تھے ہابیل اور قابیل ان کے آپس میں لڑائی ہوئی۔ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو مار ڈالا۔ تھے دونوں خاک۔ مگر ایک میں ابلیس کی شیطنت تھی اور دوسرے میں خیر کی نورانیت تھی۔ شیطنت نے انوار خیر کو بظاہر مغلوب کر لیا اور ایک بھائی کے ہاتھ سے دوسرا بھائی مارا گیا۔ مگر نہ کوئی غالب ہوا نہ مغلوب فاتح ہوا نہ مفتوح۔

جب ایک بھائی دوسرے بھائی کو مار رہا تھا تو قاتل بھی میں تھی اور آلۂ قتل بھی میں تھی۔ اور مقتول بھی میں ہی تھی۔ ہابیل اور قابیل کا ایک بہانہ تھا۔ آدم و ابلیس کا نام رکھنا ایک حجاب تھا ورنہ نہ آدم غیر تھا نہ ابلیس نہ ہابیل غیر تھا نہ قابیل۔

ایک خاکی تپلا کشتی بنا رہا تھا۔ اس تپلے کا نام نوح تھا۔ ذات پاک نے اس کو حکم دیا تھا کہ تیرے بھائی مجھ ایک ذات کے سوا کسی غیر کی عبادت نہ کریں۔ نوح نے بہت سمجھایا۔ مگر کوئی باز نہ آیا اور ہر ایک کے دل میں شیطانی ہوا ابھر گئی۔ ذات پاک نے نوح سے کہا یہ سب طوفان میں مبتلا ہونے والے ہیں تو ایک کشتی بنا اور اپنے آپ کو اور ایمان دار آدمیوں کو اس میں بٹھا تاکہ جب طوفان نمودار ہو تو تیری اور تیرے ساتھیوں کی جان سلامت رہے۔

نوح کی کشتی کو بنتا دیکھکر اس کی قوم والے مذاق کرتے تھے۔ لیکن اُن کا مذاق اُنکے سامنے آیا اور وہ سب طوفان میں مبتلا ہوئے۔ اور پانی میں ڈوب کر مر گئے۔ فقط کشتی والے محفوظ رہے۔

طوفان کہاں آیا تھا۔ مجھ خاک پر۔ پانی میں کون ڈوبا تھا۔ میں ڈوبی تھی۔ پانی میں کس نے ڈبویا تھا۔ میں نے ڈبویا تھا کہ ڈوبنے والا پانی مجھ ہی سے نکلا تھا۔ اور وہ جو مجھ خاک سے بنے تھے اور جن میں شیطانی آگ بھڑک رہی تھی وہ بھی جب طوفان میں ڈوبے تو کوئی غیر نہ ڈوبا۔ اُن کے اندر بھی میں تھی۔

نوح کو بچانے والی کشتی لکڑی اور لوہے کی تھی اور لکڑی بھی میں تھی اور لوہا بھی میں تھی۔ کشتی میں بیٹھنے والے انسان بھی مجھ ہی سے بنے تھے۔ اور کشتی میں بچنے والے حیوان بھی مجھ ہی سے بنے تھے۔ اہاہا۔ میں ڈوبی۔ میں تری۔ اور میں نے ہی ڈبویا۔ اور مجھ ہی میں وہ سب ڈوبے۔ بہانہ شکلوں اور صورتوں کا تھا۔ ورنہ نہ نوح تھے نہ کفار۔ نہ کشتی تھی نہ طوفان۔ بس میں تھی۔ اور مجھ ہی کو یہ کہنا ہے کہ یہ میری آپ بیتی ہے۔

میرا نام ابراہیمؑ رکھا گیا۔ میں آذر بت تراش کے گھر میں پیدا ہوئی۔ میں نے ایک پہاڑ کے غار میں پہلے آسمان کو دیکھا اور اس کے جگمگاتے ہوئے تاروں کو دیکھا تو کہا یہی میرا خدا ہے۔ تارے غروب ہو گئے تو میں نے کہا یہ خدا نہیں ہے۔ پھر میں نے چاند کو دیکھا تو بے اختیار منہ سے نکلا کہ یہ تو بہت چمکدار ہے یہی میرا پروردگار ہے وہ بھی چھپ گیا۔ میرا خیال پھر بدل گیا۔ پھر میں نے سورج کو دیکھا۔ وہ بہت ہی بڑا تھا وہ بہت ہی روشن تھا۔ میں نے کہا بس یہی میرا خدا ہے۔ یہ تو بہت ہی بڑا ہے مگر شام کو وہ بھی غائب ہو گیا تو میں نے کہا چھپنے اور نابود ہونے والا میرا خدا نہیں

ہو سکتا۔ میرا خدا تو وہ ہے جس نے آسمان کو زمین کو اور چاند سورج کو پیدا کیا۔

ابراہیمؑ نے خود بخود خدا کو پہچانا۔ ابراہیمؑ میں میں تھی۔ میں نے خود بخود خدا کو جانا اور پہچانا اور یہی میری بیتی ہی۔

پھر یہ ابراہیمؑ میرے بیجان بتوں کا مخالف ہوا اُنکو توڑا۔ اور اس کی سزا میں آگ میں ڈالا گیا اور پھر اس آگ کو ذات مطلق نے ٹھنڈا اور گلزار بنا دیا۔ مگر آگ میں کس نے ڈالا۔؟ میں نے۔ آگ میں کون ڈالا گیا؟ میں خود بشکل ابراہیمؑ۔ آگ گلزار کس پر ہوئی؟ مجھہ پر بصورت ابراہیمؑ۔ بت کس نے توڑے؟ میں نے بدست ابراہیمؑ۔ بت کس نے بنائے؟ میں نے بالۂ آذر۔ بت کون تھے؟ میں بشکل حجر۔ یہاں بھی میں وہاں بھی میں۔ یہ بھی میں وہ بھی میں۔ میں ہوں۔ میں ہوں۔ میں ہوں۔

"منم نمرود منم بادشاہ۔ منم معبود۔ منم مسجود۔ میں ہوں تم سب کا خدا"

نمرود یہ کہہ رہا تھا۔ اور جو اُس خاکی پتلے کو خدا نہ مانتے تھے اُنکو ستا رہا تھا۔ ایک مچھر اس کی ناک میں گھس گیا۔ اور نمرود کی خدائی کا خاتمہ کردیا۔ نمرود مرگیا اس کی خدائی بھی مٹ گئی۔ اور دنیا میں ایک فسانہ ہوگیا کہ ناچیز مچھر نے اتنے بڑے بادشاہ کا خاتمہ کردیا جو خدائی دعوے کرتا تھا۔

نمرود مجھ سے بنا تھا۔ خدائی کا دعوے میری زبان سے کرتا تھا اور جو اس کی خدائی سے انکار کرتے تھے۔ وہ بھی سب میرے پتلے تھے۔ اور جس مچھر نے نمرود کی ناک میں گھسکر اس کا کام تمام کردیا وہ بھی مجھہ ہی خاک سے نمودار ہوا تھا۔ کافر میں ہوں۔ باطل میں ہوں۔ حق پر میں ہوں۔ ناحق مجھہ سے۔ مچھر میں تھی۔ قاتل میں تھی اور سر پٹک پٹک کر مرنا بھی مجھہ ہی کو پڑا تھا۔

آگے بڑھ! مصر کو دیکھ۔ ایک تخت پر فرعون بنا ہوا کون بیٹھا ہی؟ ہامان وزیر کس کے پاس کھڑا ہے؟ موسیٰؑ کس سے کہہ رہے ہیں؟ "کہ ظلم و ستم چھوڑ دے اور میری قوم کو آزاد کردے۔ اور خدا پر ایمان لا۔ جو میرا اور تیرا پروردگار ہے"

اور سُن کہ فرعون اپنے وزیر ہامان سے کہہ رہا ہے کہ ایک اونچا سا مکان بنا۔ تاکہ میں اس پر چڑھوں اور دیکھوں کہ موسیٰؑ کا خدا کہاں ہے اور کیسا ہے۔ اے موسیٰؑ! تیرا اور تیری قوم بنی اسرائیل کا اور سب آدمیوں کا پروردگار تو

۲۵ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ

۲۶ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ

میں ہوں۔

موسیٰؑ نے اپنی لکڑی کو سانپ بنا دیا۔ فرعون کے آدمیوں نے رسیاں میدان میں ڈالیں اور وہ بھی سب سانپ بن گئیں۔ مگر موسیٰ کی لکڑی سانپ بنی تو اس نے جادو کی اُن سب رسیوں کو نگل لیا اور کھا لیا۔ فرعون موسیٰؑ سے عاجز آ گیا اور لڑائی کی نوبت آئی جنگل سے دونوں قومیں دریا میں آئیں اور دریا میں فرعون ڈوب گیا۔ اور اس کی قوم بھی تباہ ہوگئی۔

فرعون میرے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ ہامان بھی میرا ہی نام تھا۔ اور موسیٰؑ بھی میرا ہی نام ہے۔ جنہوں نے رسیوں کو سانپ بنایا وہ بھی میں۔ جنہوں نے عصا کو سانپ بنایا وہ بھی میں۔ جو دریا میں ڈوبا۔ وہ بھی میں اور جو سلامت رہا وہ بھی میں۔ کہ ہر چیز خاک بھی اور خاک سے نکلی تھی اور خاک ہی کا یہ افسانہ ہے۔ سننے کو ایک قصہ اور مورکھوں کے سمجھانے کا ایک بہانہ ہے۔ ورنہ نہ موسیٰ ہے نہ فرعون نہ ہامان تھا نہ اس کا سامان بس ان سب کا تو نام ہی نام تھا۔ حقیقت میں تو ہر جگہ میں تھی۔ اور یہی مجھ خاک کی بیتی ہے۔

یہ میری کنجیاں ہیں۔ کئی اونٹوں پر لادی جاتی ہیں اور ہر کنجی سے ایک خزانہ کا دروازہ کھلتا ہے میرا نام قارون ہے اور میں ان سب خزانوں کا مالک ہوں۔ دنیا میں کسی آدمی کے پاس اتنی دولت نہیں ہے جتنی دولت میرے پاس ہے۔ میں اس دولت کو خدا کے نام پر خرچ نہیں کرتا۔ اور کسی نیک کام میں نہیں لگاتا۔ آخر میرے سر پر اس بے شمار دولت کے انبار رکھے گئے۔ اور مجھکو زمین میں دھسا دیا گیا۔

قارون نہ تھا میں تھی۔ اس کی دولت بھی میں تھی۔ اس کی کنجیاں بھی میں تھی۔ اور جب قارون زمین کے اندر دھسا تو دھسنے والا بھی میں اور جس میں دھسا وہ بھی میں۔ اور جس دولت کو ناجائز طور پر جمع کرنے کے لئے مجھے دھسا یا گیا وہ بھی میں تھی۔ میں ہوں۔ میں ہوں۔ میں تھی۔ میں تھی۔

ایک عورت ٹوٹے ہوئے جہاز کے تختہ پر پڑی تھی۔ تختہ بہہ رہا تھا اور اس پر ایک بچہ بھی پڑا تھا جو اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا۔ ذات پاک نے موت کے فرشتے کو حکم دیا اس عورت کی جان نکال لے معصوم اور بیکس بچہ کو دیکھکر فرشتہ کو رحم آیا کہ اس دریا میں اور اس بے لسی میں اگر اس بچہ کی ماں مرگئی تو بچہ کی جان کیونکر بچیگی۔ مگر فرشتے نے ذات پاک کا حکم مانا۔ اور بچہ کی ماں کی جان نکال لی۔

۲۴ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ

۲۸ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ

یہ بچہ ذات پاک کی قدرت سے بچ گیا۔ کنارے پر آیا۔ پلا۔ پرورش ہوا۔ بڑھا اور اتنا بڑھا کہ دنیا میں بہت بڑا آدمی مانا گیا۔

اس کا نام شداد تھا۔ اس نے خدا کا انکار کیا۔ اور خدا کے مقابلہ میں زمین پر ایک بہشت بنائی اور اس کو اتنا آراستہ کیا جتنی آرائش اس زمانہ میں کسی سے ممکن نہ تھی۔

جب وہ بہشت تیار ہوئی تو شداد اس کو دیکھنے چلا۔ اور جونہی اس نے اپنا پہلا پاؤں اپنی بہشت کے دروازے میں رکھا۔ موت کے فرشتہ کو حکم آیا شداد کی روح قبض کرلو۔ فرشتہ نے پھر خیال کیا اس بدبخت نے کیسی امید سے بہشت بنائی مگر اس کو اپنی بہشت کا دیکھنا بھی میسر نہ آیا۔

اس وقت اس فرشتہ سے کہا گیا۔ یہ وہی بچہ ہے جو جہاز کے تختہ پر اکیلا ماں کے پاس پڑا تھا اور اس کی ماں کی روح قبض کی گئی تھی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں بچاتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں مٹاتے ہیں۔ ابتدا اس کی وہ تھی انتہا اس کی یہ ہے کہ بڑھتے بڑھتے خدائی دعویٰ کر بیٹھا اور بہشت بھی بنا لی

میں ہی تھا کہ جہاز کا تختہ تھی جس پر عورت بہ رہی تھی۔ اور میں ہی وہ عورت تھی جس کی روح قبض کرتے وقت فرشتہ کو رحم آیا اور میں ہی وہ بیکس اور بے بس بچہ تھی اور پھر میں ہی شداد بنی۔ خدائی دعوے کیا۔ بہشت بنائی اور پھر میری ہی اس بہشت کے دروازہ میں روح قبض کرلی گئی۔ یہ ہے میری بیتی۔ یہ ہے میری سرگذشت

میں قریش کا سردار۔ قبائل عرب میں شہرہ آفاق رئیس۔ کعبہ کا محافظ۔ میرے رسوخ اور میرے اقتدار کا چرچہ سارے عرب میں ہے۔ مگر بنی ہاشم میں ایک شخص ایسا پیدا ہوا ہے جو کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور مجھکو تمام دنیا کی بادشاہی دی گئی ہے۔ اور آسمان سے فرشتے میرے پاس آتے ہیں۔

یہ شخص اُن بتوں کو بُرا کہتا ہے۔ جو میرے اور میری قوم کے معبود ہیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کے دین میں خرابیاں نکالتا ہے۔ اس کی غرض فقط یہ ہے کہ تمام قبائل عرب کا سردار بن جائے اور میری عزت کو برباد کردے۔ اسی واسطے یہ مجھکو ابوجہل کہتا ہے اور اس کے سب ساتھی بھی جو اس کی باتوں پر یقین کرتے ہیں مجھے۔ ابوجہل کے نام سے پکارتے ہیں۔

میں اس کو مٹا دونگا۔ میں اس کو فنا کر دوں گا۔ میں اس کے نو ایجاد دین کو نابود کر دوں گا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ کل ہی سب کو جمع کر کے اس کو قتل کر ڈالونگا۔

یہ ابوجہل مجھ خاک سے بنا تھا۔ اور جو کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اس کو سن رہی تھی۔ کیونکہ وہ میری ہی زبان سے بول رہا تھا۔ مگر وہ ناکام ہوا۔ اس نے خدا کے پیارے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرانا چاہا۔ مگر وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو چلے گئے اور اپنے بستر پر اپنے چچازاد بھائی علی مرتضیٰ کو سلا گئے۔

جب اس معاملہ میں ابوجہل کو ناکامی ہوئی تو وہ فوج لیکر مدینہ پر چڑھ دوڑا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ سے نکلکر بدر کے میدان میں تھوڑے سے مسلمانوں کے ساتھ اس بڑی فوج کا مقابلہ کیا۔ جس میں ابوجہل اور اس کے سب ساتھی مارے گئے۔ لیکن دیکھو اس مغرور ابوجہل کی ایک عجیب بات کو کہ جب اس کا سر کاٹنے لگے تو اس نے خواہش کی کہ میرا سر اس طرح کاٹو کہ گردن شاندار معلوم ہو۔ گویا مرتے مرتے بھی اس کو اپنے نام ونمود کی حرص وہوس باقی رہی۔ مگر گردن کاٹنے والوں نے اس کی خواہش پوری نہ کی۔ اور اس کی گردن اس طرح کاٹی کہ سر بہت برا معلوم ہوتا تھا۔

میں خاک ہوں مگر جب انسانی شکل میں جاتی ہوں تو کیسی عجیب بن جاتی ہوں۔ ابوجہل کی شکل میں سرکش۔ مغرور۔ خودپسند تھی۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں خلیق منکسر اور فروتن تھی۔

تم کہو گے کہ یہ خاک اپنی خاکی شکل کے قصے کیوں بیان نہیں کرتی۔ انسانوں کے قصے کیوں بیان کر رہی ہے۔ حالانکہ ضرورت یہ ہے کہ خاک اپنا حال بیان کرے اور ہوا اپنا اور آگ اپنا اور پانی اپنا۔ اور پھر جمادات میں جتنی بڑی بڑی چیزیں ہیں وہ اپنا اپنا۔ اس کے بعد نباتات کی باری آئے۔ اور نباتات کے بڑے بڑے حصے اپنی سرگذشت سنائیں پھر حیوانات کا نمبر آئے۔ اور اُن کے نامور افراد اپنی اپنی بیتی پیش کریں۔ اس کے بعد آخری درجہ اشرف المخلوقات انسان کا ہوگا۔ لیکن خاک نے انسانوں کے قصے کیوں شروع کر دئیے؟ اس کو انسانوں کی بیتی بیان کرنے کا کیا حق ہے؟

میں خاک ہوں۔ اور اس اعتراض کے جواب میں یہ کہتی ہوں کہ کائنات کی اکثر اشیاء کی بنیاد میں ہی ہوں۔ سب جمادات مجھ سے نکلتے ہیں۔ اور نباتات بھی مجھ ہی سے

پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب حیوانات بھی ۔ اور سب انسان بھی ۔ اسواسطے مجھے حق حاصل ہے کہ میں اپنی بیتی کے سلسلہ میں اُن انسانوں کا حال بھی بیان کروں جواب موجود نہیں ہیں۔ اور مجھہ میں ملکر خاک ہو چکے ہیں۔ انسانوں کی بیتی بیان کرنے کا وقت آیگا تو وہی انسان اس زمرہ میں آسکیں گے جو بصورت انسان قائم و برقرار ہیں۔ ورنہ جو انسان مر چکے اور خاک میں مل چکے اب تو فقط اُن کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔ ورنہ وہ از سر تا پا مجھ میں سما گئے اور میری شکل بن گئے۔

ابوجہل اور فرعون نمرود بھی۔ اور شداد بھی اور قارون بھی۔ اور جنکو میں آگے جاکر پیش کروں گی وہ سب بھی۔ وہی ہیں اور وہی ہونگے جو مرنے کے بعد خاک ہو چکے ہیں۔ جب ابوجہل ایک سچے مسلمان ابوبکرؓ سے یہ کہہ رہا تھا کہ تم نے سنا۔ تمہارا دوست محمدؐ آج یہ کہتا ہے کہ میں رات کو ساتوں آسمان کی سیر کرنے گیا۔ اور میں نے عرش کرسی کو دیکھا۔ اور جنت دوزخ کا معائنہ بھی کیا۔ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے۔ اور کیا یہ بات سچی ہوسکتی ہے۔ تو ابوبکرؓ نے جواب دیا میں اس بات کو بالکل سچا سمجھتا ہوں۔ بیشک محمدؐ نے جو کچھ بیان کیا۔ ٹھیک بیان کیا۔ اُسی دن سے ابوبکرؓ کو صدیق کا لقب ملا۔

خیال تو کرو ابوجہل کے طعن میں بھی میرا دخل تھا۔ اور ابوبکرؓ کی تصدیق میں بھی میرا دخل تھا۔ کیونکہ انکار کرنے والی زبان بھی مجھ خاک سے بنی تھی اور اقرار کرنے والی زبان بھی مجھہ خاک سے بنی تھی۔ تو اگر سرکش تھی تو میں۔ اور مغرور تھی تو میں اور ابوجہل تھی تو میں۔ اور پھر صدیق تھی تو میں۔ اور ابوبکر تھی تو میں۔ لیکن نہیں نہیں میں کہاں۔ میں کا تو ایک بہانہ ہے۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ ذات مطلق کو خیر و شر کا تماشا دکھانا ہے۔

میں ابولہب ہوں۔ عبدالمطلب کا بیٹا۔ عبداللہ اور ابوطالب کا بھائی۔ محمدؐ کا چچا آج محمدؐ نے چادر ہلائی اور خطرہ کا اعلان کیا۔ ہمارے ہاں دستور ہے کہ جب کسی شخص کو کسی بڑے دشمن کی خبر ملتی ہے۔ تو وہ اپنی قوم کو دشمن کے حملہ سے بچانے کے لئے چادر ہلاتا ہے اور ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو کر قوم کو پکارتا ہے۔ قوم وہاں جمع ہو جاتی ہے اور وہ شخص دشمن کی اطلاع قوم تک پہنچا دیتا ہے۔ اور قوم اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیتی ہے۔ مگر آج میرے بھائی عبداللہ کے بیٹے محمدؐ نے چادر ہلائی اور قوم کو پکارا۔ اور جب ہم سب اس کے پاس جمع ہوئے تو اس نے صرف یہ کہا کہ مجھے خدا نے اپنا

شمس ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ

رسول بناکر بھیجا ہی تم ایک خدا کو مانو۔ اور بتوں کی پوجا چھوڑ دو۔ ورنہ تم پر آسمان سے عذاب آئیگا۔ جو ان پہاڑوں کے دامن تک آگیا ہی۔

جب میں نے اپنے بھائی کے بیٹے کی یہ بات سنی تو مجھے بڑا غصہ آیا کہ اس نے اپنی قوم کے سرداروں کو ایک نہایت بے سروپا بات کے لئے اتنی بڑی تکلیف دی اور ہمکو خواہ مخواہ فکرمند کردیا۔ اس لئے میں نے بے ساختہ اپنی عربی زبان میں کہا تبت یداک (تیرے دونوں ہاتھ ٹوٹیں) کیا تو نے اسی کام کے لئے چاوڑہ ہلایا تھا۔ اور کیا اسی فضول اور بے حقیقت بات کے لئے ہم سب کو بلایا تھا؟ تو میرے بھائی کے بیٹے محمدؐ کو میرا یہ لفظ بہت ناگوار ہوا۔ اور اس نے آسمان سے میرے لئے ایک عبارت نازل کرائی جس میں میرا نام اس طرح سے لیا گیا۔ تبت یدیٰ ابی لھبٍ و تب (ٹوٹیں دونوں ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گئے۔)

میرے بھائی کا بیٹا یہ کہتا ہی کہ ایک خدا کو مانو اور بتوں کو چھوڑ دو۔ اور باپ دادا کے رسم و رواج ترک کردو یا تو یہ دیوانہ ہوگیا ہی اور یا یہ ہم سب کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اور یا کوئی اور بات ہی مگر یہ کیونکر ممکن ہی کہ میں اس کا چچا۔ میں اس سے بڑا اس کے دین کو قبول کرلوں۔ اور اس کو اپنا سردار مان لوں اس نے میری بیوی اور اپنی چچی کی ہجو بھی کی۔ اور آسمان سے اس کے لئے یہ اُتروایا۔ کہ ابولہب کی بیوی کے گلے میں مونج کی رسّی باندہی جائے گی۔

میرے بھائی کا بیٹا یہ کہتا ہی کہ خدا نے ابولہب اور اس کی بیوی کی ہجو اس پر نازل کی ہے۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ اس نے خود یہ ہجو بنائی ہی۔ اور خدا کے ساتھ اس کو منسوب کردیا ہے۔ ورنہ خدا تو مجھ سے بہت خوش ہی۔ کیونکہ میں قریش میں ہوں اور ہاشم کے خاندان میں ہوں۔ اور کعبہ کی خدمت کرتا ہوں۔ اور حاجیوں کو کھانا کھلاتا ہوں اور پانی پلاتا ہوں۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ خدا میری ہجو کرے۔ میرے بھائی کے بیٹے محمدؐ نے اور کسی کی ہجو نہیں کی۔ اپنے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کا بھی نام قرآن میں نہیں لکھا۔ لیکن اپنے سگے چچا اور سگی چچی کا ذکر کیا اور ہجو کی۔ اگر اس کا دین چل نکلا اور اس کی کتاب قرآن دنیا میں پھیل گئی۔ تو میری کیسی بدنامی اور رسوائی ہوگی۔ اس واسطے میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اس کو اور اس کے دین کو اور اس کے ساتھیوں کو

ملیامیٹ کر دوں گا۔

آج کے جلسہ میں مَیں نے دیکھ لیا۔ ایک آدمی بھی اس کا ہم خیال نہیں ہے۔ اس نے فقط میرے بھائی ابوطالب کے بیٹے علیؓ کو بہکا لیا ہے۔ فقط اس نے آج کے جلسہ میں اس کی تصدیق کی۔ ورنہ اور کوئی بھی اس کی بات کا ساتھی اور حامی نہ تھا۔

یہ سب باتیں ابولہب نے جس زبان سے کیں۔ وہ زبان مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس کو بڑا صدمہ اس بات کا ہوا کہ خدا نے قرآن میں اس کا نام لیکر ہجو نازل کی۔ مگر اس نے یہ خیال نہ کیا کہ جلسہ میں سوائے اس کے اور کسی نے بھی محمدؐ رسول اللہ کے ساتھ سخت کلامی نہ کی تھی۔ اور سب لوگ خاموش رہے مگر محمدؐ رسول اللہ کے سگے چچا ابولہب نے نہایت سخت کلامی کے ساتھ حاضرین جلسہ کو رسولؐ اللہ کے خلاف بھڑکایا۔ اگر ابولہب بھی خاموش رہتا تو شاید رسول اللہ کو ناکامی نہ ہوتی۔ میں شرمندہ ہوں کہ ابولہب جیسا گستاخ مجھ سے بنایا گیا اور میں فخر کرتی ہوں کہ علی مرتضیٰ جیسا فدائی بھی مجھ خاک سے بنا تھا۔ جس نے محمدؐ رسول اللہ کی بھرے مجمع میں تصدیق کی۔

میں بادشاہ ہوں۔ شام کا ملک میرا۔ ایران کا ملک میرا۔ مصر کا ملک میرا۔ عراق کا ملک میرا۔ اور حجاز کا ملک بھی میرا۔ میرا نام یزید ہے میں معاویہ ابن ابوسفیان کا بیٹا ہوں۔ دمشق میرا پایہ تخت ہے۔ جو شام کا مشہور خوبصورت شہر ہے۔ بنی ہاشم میرے دشمن ہیں۔ میں بنی امیہ خاندان میں ہوں۔ اس لئے میں اور میرا سارا خاندان بنی ہاشم کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔

جب میں تخت پر بیٹھا۔ تو مجھے سب سے زیادہ حسینؓ ابن علیؓ ابن ابی طالب کا اندیشہ تھا کہ وہ میرے خلاف بغاوت کرے گا۔ کیونکہ حسینؓ کے بڑے بھائی حسنؓ ابن علی سے میرے باپ معاویہ نے یہ سلطنت اس شرط پر حاصل کی تھی کہ معاویہ کے بعد مسلمان جس کو چاہیں گے اپنا بادشاہ بنائیں گے۔ معاویہ کو یہ حق نہیں ہوگا کہ اپنی اولاد کو جانشین بنائے مگر میرے باپ معاویہ نے اس عہد اور اس شرط کی پابندی نہیں کی۔ کیونکہ اور کوئی لائق آدمی سلطنت کے قابل موجود نہ تھا۔ اگر کسی اور کو مسلمان بادشاہ بنا لیتے تو اسلامی مقبوضات میں خرابی پڑ جاتی۔ اس لئے میرے باپ نے مجھکو اپنا ولی عہد محض مسلمانوں کی بھلائی کے لئے مقرر کر دیا۔ مگر حسینؓ ابن علیؓ نے اس مصلحت کو نہ سمجھا۔ اور اس نے

ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

میرے خلاف بغاوت کی۔ اس لئے میں نے محض انتظام سلطنت کے لئے اس کو اور اس کی اولاد کو اور اس کے ساتھیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔

جس دن حسینؓ ابن علیؓ اور اس کی اولاد اور اس کے ساتھیوں کے کٹے ہوئے سر میرے سامنے لائے گئے اور جس دن حسینؓ ابن علیؓ کے اہل بیت رسیوں سے بندھے ہوئے قیدیوں کی شکل میں میرے سامنے پیش ہوئے تو میں نے مصلحت وقت کے خیال سے یہ کہا۔ کہ میں نے حسینؓ ابن علیؓ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ ابن زیاد نے میری اجازت کے بغیر ناحق حسینؓ کو مار ڈالا۔ مگر میرا دل مسرور تھا اور میں خوش ہو رہا تھا کہ میری سلطنت کا سب سے بڑا حریف مر گیا۔ اور سب سے بڑا کانٹا نکل گیا۔ سلطنت کے لئے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہیگا۔ میں انتظام حکومت کے لئے اس سے بڑھ کر سفاکی کو جائز سمجھتا ہوں۔

مجھے معلوم ہے کہ لوگ مجھپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں نے ابن رسول اللہ کو بے گناہ مار ڈالا۔ لیکن میں ان الزام لگانے والوں سے کہوں گا کہ تمہارے ابن رسول اللہ نے بھی تو میرے خلاف خواہ مخواہ بغاوت کی تھی۔ حالانکہ نہ اُن کے پاس فوج تھی۔ نہ ان کے پاس روپیہ تھا نہ اُن کے پاس ملک تھا۔

مجھ پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور میں شریعت اسلام کے خلاف کام کرتا ہوں۔ اور حسینؓ ابن علیؓ نے میری بیعت اس واسطے قبول نہ کی کہ وہ مجھکو فاسق اور گنہ گار سمجھتا تھا۔ لیکن میں فاسق نہیں ہوں۔ نہ میں گنہ گار ہوں۔ بلکہ میں احکام اسلام میں جو کچھ تبدیلی کرتا ہوں وہ میرا اجتہاد ہے اور چونکہ میں مسلمانوں کا خلیفہ اعظم ہوں اس واسطے مجھے اس اجتہاد کا حق حاصل ہے۔

میں بادشاہ ہوں اور بادشاہوں کو دل اور دماغ کی تفریح کے لئے کھانا پینا ضروری ہے۔ میں رات دن دل و دماغ سے کام لیتا ہوں۔ اس واسطے مجھکو خوبصورت عورتوں سے جی بہلانے اور تفریح کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ تاکہ میں صحیح دماغ کے ساتھ انصاف کر سکوں۔

ٹھہر ٹھہر۔ یزید۔ زیادہ نہ بول۔ زیادہ نہ بک۔ تو مر گیا۔ تو قبر میں ڈوب گیا۔ تیری قبر پر روزانہ پیشاب کیا جاتا ہے۔ اور پتھر مارے جاتے ہیں۔ تیری قبر دمشق میں آجتک ٹھکرائی جاتی ہے اور صبح سے شام تک اتنے پتھر اس کے مارے جاتے ہیں

کہ حکومت شام کے وقت کئی مزدور لگا کر انکو صاف کراتی ہے۔ تونے حسینؓ ابن علیؓ کو بے گناہ مارا۔ تو قیامت تک لعین کہا جائیگا اور تجھکو لوگ مردود کہکر پکاریں گے۔ انتظام سلطنت کو بدنام نہ کر تونے مسلمانوں کے لئے حسینؓ کو نہیں مارا۔ بلکہ اپنے نفس کی خواہش کے لئے اس غریب کو نہایت بے دردی سے ذبح کرڈالا۔ حسینؓ نے بغاوت نہیں کی۔ خلافت حسینؓ کا حق اور ورثہ تھی۔ اور تو نے اس ورثہ کو دبا لیا تھا۔ اور اس حق کو چھین لیا تھا۔ اور جو لوگ حق و صداقت کے حامی ہوتے ہیں وہ فوجوں کے بغیر اور روپے کے بغیر اور ملکوں کے بغیر ہی لڑا کرتے ہیں۔ چنانچہ حسینؓ نے بھی ایسا ہی کیا۔ اور بحالت بے سروسامانی تیری فوج کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور حق و صداقت کے لئے جان دیدی۔

تو اپنی عیاشی کے لئے سند پیش کرتا ہے۔ تو شراب خواری کی بھی دلیل لاتا ہے۔ مگر تیری دونوں دلیلیں اور تیرے سب بیانات اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہیں۔

جب میں خاک یہ خیال کرتی ہوں کہ مجھ ہی سے تجھ یزید کا پتلا تیار ہوا تھا۔ تو میں کانپ جاتی ہوں۔ لرز جاتی ہوں کہ تونے بڑی ہی سفاکی رسولؐ اللہ کے خاندان کے ساتھ کی۔ اور تو قیامت تک کروروں آدمیوں کے لعن طعن کو سنتا رہیگا۔

مگر تو کہاں سنیگا۔ تو تو مر گیا۔ اور مٹ گیا۔ اس کو تو میں سنوں گی۔ کہ میں ہی تیرے وجود کے اندر تھی۔ اور یہ شرم مجھکو ہمیشہ تکلیف دیتی رہیگی۔

تیرے اشارے اور حکم کے سبب تیرے گورنر ابن زیاد اور تیرے کمانڈر عمرؓ ابن سعد اور تیرے جرنیل شمر اور خولی ابن یزید نے ایسی ایسی سفاکیاں کیں اور ایسی ایسی بے رحمی اور بے دردی سے بنی فاطمہ کو بھوکا پیاسا رکھا اور اُن کے گلے پر خنجر چلائے اور اُن کے بدن تلواروں اور تیروں اور برچھیوں سے چھلنی کئے کہ آجتک روئے زمین پر کسی نے ایسی بے رحمی اور ایسی بیدردی کا کام نہ کیا ہوگا۔

یزید! مجھے تیرے کام سے شرم آتی ہے۔ یزید! مجھے تیرے گورنر ابن زیاد کے کام سے شرم آتی ہے۔ یزید مجھے تیرے کمانڈر عمرو ابن سعد کے کام سے شرم آتی ہے۔ یزید! مجھے تیرے جرنیلو شمر بن ذی الجوشن اور خولی بن یزید کے کاموں سے شرم آتی ہے۔ کاش تم سب آگ سے بنائے جاتے۔ اور کاش تم سب شیطان مشہور ہوتے۔ اور یا کاش تم سب یہ سفاکی یہ بیدردی۔ یہ بے رحمی نہ کرتے۔ جو تم نے کربلا کے میدان میں کی۔

آج میں خاک، اے یزید جب تیرا قصہ بیان کرتی ہوں تو رنج وغم کے سبب شق ہوئی جاتی ہوں اور جو فلسفہ میرے پیش نظر ہے وہ سب ہجوم الم کے سبب میرے ہاتھوں سے چھوٹا جاتا ہے۔ یزید! تو مٹ گیا۔ ابن زیاد! تو فنا ہوگیا۔ عمر وبن سعد! تیرا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا۔ شمر! تو بھی غارت ہوگیا۔ خولی! تو بھی فی النار ہوگیا۔ مگر تم سب نے مجھ خاک کی عزت برباد کر دی۔ تم سب مجھ خاک سے بنے تھے۔ مگر تم نے حسینؓ ابن علیؑ شہ لولاک کو شہید کر کے میری آبرو پر پانی پھیر دیا۔ اور میں عناصر اربعہ کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔

میں چنگیز خاں ہوں مغل قوم کا سردار۔ لاکھوں سپاہی میرے ساتھ ہیں۔ اور وہ سب جنگجو اور بہادر ہیں۔ میں نے اُن سب بادشاہوں کو زیروزبر کر دیا۔ جو میرے عہد میں بڑی طاقت والے مانے جاتے تھے۔ اور میں نے مسلمانوں کی سلطنت کو پاش پاش کر ڈالا جس نے تمام دنیا کو مرعوب کر رکھا تھا۔ میں نے عباسیہ خلافت کا جاہ وجلال خاک میں ملا دیا۔ جو تمام اسلامی دنیا کی مذہبی اور سیاسی پیشوا بنی ہوئی تھی۔

جب چنگیزی فوجیں بغداد کے نیچے پہنچیں۔ اُنہوں نے ایک دن میں کئی لاکھ مشائخ علما۔ امرا۔ اور نامور مسلمان بے گناہ قتل کر ڈالے اور اُن کی لاشیں دجلہ دریا میں پھینک دیں جس سے دجلہ دریا کا رنگ۔ لال ہوگیا۔ اور بغداد میں کوئی نامی مسلمان باقی نہ رہا۔ جس کے گلے پر چنگیز تیری چھری نہ چلی ہو۔

بغداد جو اسلامی سیاست وحکومت اور اسلامی تمدن و تہذیب اور اسلامی علوم فنون کا مرکز تھا۔ چنگیزی مغلوں کے ہاتھوں اس بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

اور عباسیہ خاندان کا خلیفہ بھی چنگیزی مغلوں کے ہاتھ سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

چنگیز نے اور اس کی فوج نے اور چنگیز کے جانشین مغلوں نے یہ خونریزیاں کیوں کیں۔ اور یہ سفاکیاں اُن سے کیونکر سرزد ہوئیں۔ اس کا جواب چنگیز اور اس کی اولاد ہی دے سکتی ہے۔ لیکن وہ سب بے رحم تھے۔ اور اللہ کی مخلوق کو بے گناہ مار ڈالنا اُنکو اچھا معلوم ہوتا تھا وہ رعایا کے قتل عام کے بغیر ہی ملک فتح کر سکتے تھے اور اُن پر قابض ہوسکتے تھے۔ مگر وہ جنگل کے جانور تھے اور بے تہذیب ڈاکو تھے۔ جنہوں نے ملکیت اور مالیت لوٹنے کے لئے پہلے مالکوں کی نہایت بے رحمی کے ساتھ جانیں لیں۔ اس کے بعد مقتولوں کی مالیت

اور ملکیت پر قبضہ کیا۔

یہ اس سفاکی اور جلادی کے سبب ہلاکو کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور انہوں نے خدا کی زمین پر چاروں طرف ہلاکت اور تباہی برپا کر دی۔

چنگیز بے گناہوں کے سر کٹواتا تھا اور خون بہنے کے تماشے دیکھتا تھا۔ مگر اس کو یہ خیال نہ آتا تھا کہ ایک دن مجھکو بھی مرنا ہے اور اس چند روزہ زندگی سے جدا ہونا ہے لیکن جب وہ مرگیا اور خاک بن گیا تو میں نے اس کے جسم کی خاک سے پوچھا کہ تونے اپنی زندگی میں اتنے ظلم وستم کیوں کئے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے کوئی ظلم وستم نہیں کیا یہ تیری بڑی بھول ہے کہ ہر انسان کے بُرے اعمال کا الزام اپنی جنس خاک پر لگاتی ہے اور اس بات کو بھول جاتی ہے کہ خاک سراسر بے خطا اور بے قصور ہے۔ آدمی کا جسم خاک سے بنتا ہے۔ لیکن اس میں غیظ وغضب اور ظلم وستم اور غرور وسرکشی۔ آتشی مادہ سے پیدا ہوتی ہے اور یہ آتشی حرارت کے غلبہ سے انسان یہ سب گناہ کرتا ہے۔ اور آتش خاک پر غالب آجاتی ہے اور جو چاہتی ہے انسان سے کرا دیتی ہے۔ اور اسی واسطے کہا گیا ہے کہ شیطان سب گناہ کراتا ہے۔ اور شیطان آگ کا بنا ہوا ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ انسان جتنے بُرے کام کرتا ہے وہ آتشی عنصر کے تقاضہ سے کرتا ہے اور جتنی نیکیاں کرتا ہے وہ نوری اور خاکی اور آبی عناصر کے تقاضہ سے ہوتی ہیں۔ اس واسطے اے خاک! تجھے اپنی جنس کو بدنام نہ کرنا چاہیئے۔ اور یہ بیان عنصر آتش کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ جب آتش کا بیان آئیگا اس وقت ان گنہگار انسانوں کا سارا کچا چٹھا بیان ہو جائیگا۔

خاک نے کہا تو ٹھیک کہتی ہے مگر تو غلط کہتی ہے۔ بیشک قصور نفسانی خواہشات کا ہے خاکی پتلے کا نہیں ہے۔ اور نفسانی خواہشات آتشی عنصر سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور انسان آب باد و آتش و خاک کے عناصر سے مرکب ہو کر بنا ہے۔ لیکن میں خاک ظرف ہوں اور وہ سب مظروف ہیں۔ میں گھر ہوں اور وہ سب بسنے والے ہیں۔ میں سڑک ہوں اور وہ مجبیر چلنے والے ہیں۔ میں سوکھا دریا ہوں اور وہ بہنے والے پانی ہیں۔ میں بانسری ہوں اور وہ بجنے والی آوازیں ہیں۔ اگر بانسری نہ ہو تو لے اور سُر کہاں سے نکلیں۔ اگر دریا نہ ہو تو پانی کہاں بہے۔ اگر سڑک نہ ہو تو راستہ کس پر چلیں۔ اگر گھر نہ ہو تو رہنے والے کہاں رہیں۔ اگر کٹورا نہ ہو تو پانی کس چیز میں بھرا جائے۔ اس واسطے میں اپنی ہی جنس

خاک کو اس معاملہ میں مخاطب کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ عاجزی اور کسر نفسی میری جبلت اور خصلت میں داخل ہے۔

نور و نار انسان کے وجود میں لڑتے رہتے ہیں یہانتک کہ انسانوں کے ایک گروہ نے انہی دو قوتوں کی کش مکش کو دیکھکر دو خدا مان لئے۔ ایک کا نام یزدان رکھا اور دوسرے کا اہرمن نور کو یزدان کا مظہر تصور کیا اور اہرمن کا مظہر نار کو اور آگ کو مانا۔ مگر میں اس دوئی کے خلجان سے پاک ہوں اور آزاد ہوں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ خاک بھی وہی۔ باد بھی وہی۔ آب بھی وہی آتش بھی وہی۔ نور بھی وہی۔ تاریکی وہی۔ خشک بھی وہی۔ تر بھی وہی۔ خیر بھی وہی۔ شر بھی وہی۔ نہ میں خاک پانی سے جدا۔ نہ پانی مجھہ خاک سے جدا نہ آگ ہوا سے جدا۔ نہ ہوا آگ سے جدا۔ نہ آکاش و خلا زمین سے جدا۔ نہ زمین آکاش سے جدا نہ آسمان آکاش سے الگ نہ آکاش آسمان سے علٰحدہ۔ نہ نور ظلمت کا بیری۔ نہ ظلمت نور کی دشمن۔ نہ دن رات سے جدا۔ نہ رات دن سے علٰحدہ۔ نہ خشک و تر میں جدائی۔ نہ خیر و شر میں دوری حقیقت سب کی ایک ہی ہے۔ فرق و تفاوت جب ہوتا ہے کہ نا سمجھہ اور انجان فرق و تفاوت کی نظر سے وحدت کی کثیر شکلوں کو دیکھتے ہیں۔ آنکھیں دو ہیں مگر دیکھنے والا ایک ہے اور نظر بھی ایک ہی آتا ہے۔ کان دو ہیں مگر سننے والا ایک ہے اور سنائی بھی ایک ہی دیتا ہے۔ جو ایک وقت میں تر نظر آتا ہے وہی ایک وقت میں خشک نظر آتا ہے اور جو ایک وقت میں خیر نظر آتا ہے۔ وہی ایک وقت میں شر بنجاتا ہے۔ بہروپیہ طرح طرح کے روپ بدلتا ہے اور جس روپ میں سامنے آتا ہے۔ اسی روپ کے نام سے اس کو پکارا جاتا ہے۔

اری شمس او اعتراض کرنے والی تونے یہ بھی دیکھا کہ دن کے وقت بہت سے رنگ نظر آتے ہیں۔ یہ کالا ہے یہ سفید ہے۔ یہ زرد ہے۔ یہ لال ہے۔ یہ نیلا ہے۔ یہ فیروزی ہے۔ یہ زعفرانی ہے یہ ایسا ہے۔ یہ ویسا ہے۔ لیکن جب رات ہو جاتی ہے تو اندہیرے میں سب رنگ ایک ہو جاتے ہیں۔ نہ لال کی لالی رہتی ہے نہ سبز کی ہریاول۔ نہ زرد کی زردی۔ نہ نیلے کی نیلاہٹ۔ کیونکہ تاریکی ہر رنگ پر اپنی سیاہی پھیر دیتی ہے۔ اور سب رنگ تاریکی کے رنگ میں چھپ جاتے ہیں۔ تو کہیگی کہ سورج سے سب رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ میں کہونگی سورج تو عارضی ہے اور تاریکی اصلی ہے۔ ذرا دیکھ جس وقت خوب سورج چمک رہا ہو۔ اور دھوپ پھیلی ہوئی ہو۔ اپنے کمرہ کے دروازے اس طرح بند کر دے کہ سورج کی روشنی کسی جگہ سے اندر نہ آسکے تو سارے

کمرہ میں اندھیرا ہو جائیگا۔ تو معلوم ہوا کہ دن کے وقت بھی ہر جگہ اندھیرا ہی رہتا ہے۔ اور سورج کی روشنی عارضی ہوتی ہے۔ پس جو چیز عارضی ہے وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتی اور جو چیز اصلی ہے اسی سے سب چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

ظلمت اور تاریکی اور اندھیرا بھی اصلی نہیں ہیں وہ بھی عارضی چیز ہے۔ ذات مطلق کی زلف مجازی اور گیسوئے مثالی کا نام ظلمت ہے۔ جب گیسو رخ پر آتے ہیں تو حسن رخسار اُن سے چھپ جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی رخسار کے حسن اور خوش نمائی میں ایک نئی بات پیدا ہو جاتی ہے۔ میں بجھ سے اور کیا کہوں بحث نہ کر اس کو۔ کہنے کو یونہی چلنے دے۔ کہ جس نے پوچھا یہ کیوں؟ وہی رہ گیا ادھر رستہ میں اور جس نے چون چرا نہ کی وہ منزل پر پہنچ جاتا ہے اور منزل پر پہنچنے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس شاعر نے قسم کھا کر یہ شعر پڑھا تھا کہ ع۔

بخدا غیر خدا در دو جہاں چیزے نیست

اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اور کچھ دیکھ کر پڑھا تھا اور کچھ سمجھ کر پڑھا تھا۔ کہ واقعی دونوں جہاں میں اور کون و مکان میں ایک ذات کے سوا اور کوئی غیر نہیں ہے اور جو کچھ غیر نظر آتا ہے وہ سب عارضی اور فانی ہے۔ کیونکہ غیریت اسی میں ہے جس میں تبدیلی ہو تغیر ہو اصل چیز نہ بدلتی ہے نہ اس میں کسی قسم کا تغیر ہوتا ہے۔ رنگا رنگی آنکھ دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ لال ہے۔ یہ کالا ہے۔ یہ زرد ہے یہ نیلا ہے۔ مگر جب حقیقت کی ظلمت سامنے آجاتی ہے تو سب رنگ مٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ جب تاریکی زیادہ ہو جائے تو آنکھ کی دید بھی بیکار ہو جاتی ہے۔ اور انسان کو اپنے جسم کا ہاتھ بھی نظر نہیں آتا۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ ایسا سخت اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ دکھائی دیتا تھا۔

نور کو نور دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روشنی میں آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ مگر اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتی۔

جسم کی راکھ نے عنصر خاک کا یہ بیان سنا تو اس نے کہا میں انجان ہوں۔ میں ناواقف ہوں۔ میں نے غلطی کی جو تجھ پر اعتراض کیا۔ تو جو کہتی ہے سچ کہتی ہے۔ میں جو کہتی ہوں وہ میرا انجان پن ہے۔ مگر میں نے سنا ہے کہ جو جانتے ہیں وہ کہتے نہیں اور جو کہتے ہیں وہ کچھ جانتے نہیں۔

خاک نے کہا لے راکھ، تو ٹھیک کہتی ہے کہ جن پر حقیقت کھل جاتی ہے۔ وہ چپ ہو جاتے ہیں اور بولتے وہی ہیں جو حقیقت سے واقف نہیں ہوتے۔ جس کا باطن اور اندرون خالی ہوتا ہے وہی زیادہ بولتا ہے۔ بانسری اسی واسطے بولتی ہے کہ اندر سے خالی ہے۔ ڈھول اور نقارہ اسی واسطے غل مچاتا ہے کہ اندر اس کے کچھ نہیں ہوتا۔ مگر میں جو تجھ سے اور سب سے اسرار حقیقت کہہ رہی ہوں کھول کھول کر بیان کر رہی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک اسرار کو اور ذات مطلق کے بھید کو ظاہر نہیں کیا جائیگا اس وقت تک آجکل کے منکر زمانہ میں لوگوں کو اصلی اور سیدھا راستہ نہیں ملیگا۔ ابتک سورج بھی چپ تھا چاند بھی خاموش تھا تارے بھی زبان نہ کھولتے تھے۔ آکاش بانی بھی ہر ایک کو سنائی نہ دیتی تھی۔ زمین پہاڑ۔ سمندر دریا۔ درخت حیوانات سب ہی خاموش تھے۔ نہ درندے پوشیدہ بھید زبان سے کہتے تھے نہ چرندے نہ درخت لب کشائی کرتے تھے۔ نہ لوہا نہ چاندی۔ نہ سونا۔ نہ ہیرا۔ نہ پنا نہ موتی۔ نہ اونچے اونچے پہاڑ۔ جو لاکھوں انسانوں کے قد سے اونچے تھے۔ نہ آکاش جس میں سب انسان اور حیوان اور نباتات اور جمادات قائم نظر آتے ہیں۔ نہ چمکنے والا سورج جس کو سب حقیقت معلوم ہے نہ دمکنے والا چاند جو اپنے تاروں کی فوج کے ساتھ اسرار حقیقت کے راز کو اور بھید کو جانتا ہے۔ یہ سب اسواسطے چپ تھے کہ حقیقت کا بھید خود انسان کی صورت میں چھپا ہوا تھا۔ اور بہت سے انسان اس بھید کو جانتے تھے۔ اور اس بھید کے سبق ایک دوسرے کے کان میں کہتے تھے۔ مگر اب یہ انسان حقیقت سے منکر ہو گیا تھا اس نے کہا۔ میں ہوائی جہاز اڑاتا ہوں ـــ ہوا میری مملوک ہے۔ میں سٹیمر چلاتا ہوں غوطہ خور کشتیاں ڈوراتا ہوں۔ سمندر میرا مغلوب ہے۔ ریلیں چلاتا ہوں۔ پانی۔ آگ۔ بجلی سے کام لیتا ہوں۔ بجلی میری گاڑیاں کھینچتی ہے۔ بجلی مجھے پنکھا جھلتی ہے۔ میں ان تمام عناصر سے ہر طرح کی غلامی اور خدمت گاری کا کام لیتا ہوں۔ تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کائنات کی حقیقت پر غور کروں اور مجھے یہ خیال ہوا کہ ان سب باتوں کے سوا کوئی اور حقیقت بھی پوشیدہ ہے۔

جب انسان کے انکار اور سرکشی کی حالت عام ہونے لگی تو ذات مطلق نے کائنات کے تمام موجودات کو حکم دیا کہ تم سب بولو۔ اور اظہار حقیقت کے لئے زبان کھولو۔ انہوں نے کہا ہم سب کو زبان دے۔ ایسی زبان جو تمام موجودات عالم اور کائنات اعظم کی مشترکہ زبان ہو

حکم ہوا زبان مشترک ہو یا نہ ہو لیکن تمہاری بولی سب کو سمجھائی جائے گی۔ اور ایسا ہوگا کہ انسانوں میں سے ایک مورت۔ ایک پتلا۔ ایک پیکر۔ ایک وجود آگے بڑھے۔ اور تم سے تمہاری زبان میں حقیقت حیات سُنے اور پھر اس کو انسانی زبان میں اُن تک پہنچائے جو اسرار حقیقت کے منکر ہو گئے ہیں۔

اس انسانی مورت نے کہا میرا نام حسن نظامی ہے۔ میں تم سب کی بات سنوں گا اور میں ان سب باتوں کو سمجھوں گا۔ اور پھر اپنے ہم جنس انسانوں کو سمجھاؤں گا۔

پس آج میں خاک اپنی بیتی حسن نظامی کو سنا رہی ہوں۔ ظاہر میں یہ بیتی معمولی گذرے ہوئے افسانے ہیں اور اشیائے عالم کی بیتی ہوئی سر گذشت ہے جس میں نہ کوئی ندرت ہے نہ کوئی ایسی چیز ہے جسکا علم پہلے سے انسان کو نہ ہو۔ مگر اس بیتی اور ان واقعات کا طرز بیان اور طرز ادا ایسا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مثال کی صورت میں سامنے آتے ہیں اور پھر اس مثال کا انجام اور نتیجہ حقیقت و صلیت کی تہ تک آدمی کے ذہن اور فکر اور خیال کو لیجاتا ہے اور جب بار بار مختلف مثالوں اور مختلف واقعات اور مختلف حالات کے ذریعہ حقیقت اور صلیت کے اشارے انسان کے دماغ تک جاتے ہیں۔ تو وہ وہاں ان اشاروں کو جوڑ جوڑ کر ایک دوربین بناتے ہیں اور وہ دوربین بہت سے شیشوں کے جوڑ سے اتنی طاقتدار بنجاتی ہے کہ اسرار حقیقت کو دیکھ سکے۔ اور منکرین حقیقت کو دکھا سکے۔

مرگھٹ کو دیکھ۔ جہاں انسان جلائے جاتے ہیں۔ قبرستان کو دیکھ جہاں انسان دبائے جاتے ہیں اور اس برج خاموش کو بھی دیکھ۔ جہاں آتش پرستوں کے مردے بٹھائے جاتے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں انسان کو اپنی عمر پوری کر کے جانا پڑتا ہے۔ اور جہاں کے سفر کا ہر انسان کو یقین ہے۔ مگر پھر بھی سب غفلت میں مبتلا ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ہم کو کہاں جانا ہے۔ اور پھر کیا ہو جانا ہے۔

میں مرگھٹ ہوں۔ بڑے بڑے رشی منی۔ راجہ مہاراجہ حسین و خوبصورت عورت و مرد بچے اور بوڑھے۔ جنکی زندگی میں بڑی دھوم دھام تھی۔ جب مر گئے تو ارتھی میں لپٹ کر میرے ہاں آئے اور جھپیر ایک چتا چُنی گئی اور اس چتا میں ان کا جسم جلایا گیا۔ اور جب وہ جسم راکھ ہو گیا تو ان کا جسمانی نقش مٹ گیا۔ اور جہاں سے وہ گئے تھے وہیں پھر آ گئے۔

۲۰ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ

میں برج خاموشں ہوں۔ مجھ میں بڑے بڑے بادشاہ اور امیر اور بڑے بڑے ہوبہ۔ عورت مرد مرنے کے بعد آتے ہیں اور رکھ دئے جاتے ہیں اور پھر گدھ اور چیلیں اور کوے اُن کا گوشت کھا جاتے ہیں اور اُن کے معدوں میں ہضم ہو کر وہ گوشت مٹی بنجاتا ہے۔ اور وہ مٹی میرے اندر سما جاتی ہے۔

میں قبرستان ہوں۔ مسلمان یہودی اور عیسائی اور سب دفن کرنے والی قومیں میرے اندر آتی ہیں بڑے سے بڑے بہادر اور بڑے سے بڑے بادشاہ اور بڑے سے بڑے نازک مزاج سب ہی میرے اندر ایک شان اور ایک ہیبت سے آکر لیٹتے ہیں اور چند روز میں گل سڑ کر خاک ہو جاتے ہیں۔

جس وقت کسی مسلمان انسان کو مجھ میں دفن کیا جاتا ہے تو یہ آیت پڑھی جاتی ہے۔ جو قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مخاطب کر کے فرمائی تھی۔ منہا خلقنا کم وفیہا نعیدکم تارۃً اخریٰ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے انسانو۔ ہم نے تم کو خاک ہی سے پیدا کیا تھا۔ اور پھر آخر کار خاک ہی کے اندر تم کو لے جائیں گے۔ پس جب وہ خاک کے اندر آجاتے ہیں تو خاک ہی بن جاتے ہیں۔ لہذا ہر مرگھٹ مجھ خاک کی ایک بیتی ہے اور ہر برج خاموشں مجھ خاک کی ایک سرگذشت ہے۔ اور ہر قبرستان مجھ خاک کی ایک کہانی ہے۔

تم خیال کرتے ہو آبادی اُن شہروں اور قصبات اور دیہات میں ہے۔ جہاں زندہ انسانوں کے محل ہوں۔ حویلیاں ہوں۔ اور رہنے کے مکانات ہوں۔ مگر نہیں آبادی اس کو کہتے ہیں کہ جس میں آباد ہونے کے بعد پھر واپسی کی ضرورت نہ رہے۔ اور آباد ہونے والے ہمیشہ اسی جگہ رہیں بہیں۔ مگر زندگی کی آبادیاں ایسی نہیں ہیں۔ وہاں بادشاہوں کے محل اور امیروں کی حویلیاں اور غریبوں کے جھونپڑے سب ہی اپنے اندر رہنے والوں کو قبرستان اور مرگھٹ اور برج خاموشں میں بھیجتے رہتے ہیں۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ برج خاموشں اور مرگھٹ اور قبرستان کے باشندے اپنی آبادی کے کچھ لوگ شہروں اور قصبوں اور دیہات کی آبادی میں بھیجیں۔ تو معلوم ہوا کہ آبادی اصل وہی ہے جو کبھی غیر آباد نہ ہو اور کبھی اُس آبادی کے باشندے نقل مکان نہ کریں۔ اور یہ حالت صرف برج خاموشں اور مرگھٹ اور قبرستان ہی کی ہے کہ وہاں

جو شخص آباد ہوتا ہے۔ پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ اور نہ نقل مکان کرتا ہے اور شہروں اور قصبوں اور دیہات کے رہنے والے سب کے سب اپنی جگہیں بدلتے رہتے ہیں

قبر کے باشندے بڑے ملنسار ہوتے ہیں۔ بڑے نیک ہوتے ہیں۔ چاہے زندگی میں وہ کیسے ہی شریر ہوں۔ لیکن قبرستان میں آنے کے بعد اتنے نیک ہو جاتے ہیں کہ جب کوئی اُن کے پاس آکر بیٹھتا ہے تو وہ اُس سے اُکتاتے نہیں۔ اور جب کوئی اُن کے پاس سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے تو وہ اس کو روکتے نہیں۔ اور نہ پیٹھ پیچھے اپنے پاس آنے والے کو بُرا کہتے ہیں۔ نہ اس کی غیبت کرتے ہیں۔ نہ اُس کے عیب نکالتے ہیں۔ جیسا کہ زندہ انسانوں کا دستور ہے کہ جب کوئی اُن کے پاس آتا ہے تو وہ اخلاق سے ملتے ہیں۔ اور جب کوئی اُن سے جدا ہونا چاہتا ہے تو وہ اس کو جانے سے روکتے ہیں اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ چلا جاتا ہے تو اس کی صورت شکل میں اور اس کے لباس میں اور اس کی بات چیت میں عیب نکالتے ہیں اور بدگوئی اور غیبت کرتے ہیں۔

قبرستان کے باشندوں کو نہ کوئی دُکھ ہے نہ بیماری۔ نہ کوئی غم ہے نہ فکر۔ نہ دشمنی ہے نہ دوستی۔ نہ اختلاف ہے نہ اتفاق۔ دو دشمن پاس پاس دفن ہوتے ہیں۔ مگر آپس میں لڑتے نہیں۔ دو دوست قریب قریب دفن ہوتے ہیں۔ مگر آپس میں ملتے نہیں وہ بڑی بے خبری میں ہیں اور اُن کی بیخبری پر جو شخص توجہ کرتا ہے اور غور کرتا ہے وہ اسرار حقیقت سے خبر دار ہو جاتا ہے۔

قبرستان کے باشندے بڑی گہری نیند میں سو رہے ہیں۔ اُنہوں نے نیند کی دوا نہیں کھائی۔ نہ یہ کسی دوا سے جاگ سکتے ہیں۔ ان کے چہرے اور جسم خاک و غبار کے انبار میں چھپے ہوئے ہیں۔ مگر حسرت و نامرادی قبر کے ڈھیر پر سامنے بیٹھی رہتی ہے اور اپنے زیارت کرنے والوں کو نظر آیا کرتی ہے۔ بشرطیکہ زیارت کرنے والے آنکھیں رکھتے ہوں۔

زندہ انسان ان قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں اور ان کے سرہانے چراغ جلاتے اور ان کے سامنے قوالیاں کرتے ہیں۔ مگر قبرستان کے باشندوں کو نہ پھولوں سے کچھ سروکار ہے نہ اُنکو چراغ درکار ہے اور نہ وہ قوالی سننی چاہتے ہیں۔ اور ان کے

ساتھ ہی وہ قوالی سے بیزار بھی نہیں ہیں۔ اور اپنے قریب چراغوں کی روشنی بھی اُنکو ناگوار نہیں ہوتی۔ اور قبر کے اوپر پھول ڈالنے سے بھی کچھ ناراض نہیں ہوتے۔ وہ تو سب کے سب ایک گہری سوچ میں ہیں۔ ایک اصلی زیدیں ہیں۔ اور ایک یقینی شنید میں ہیں کہ وہی سوچ اور وہی فکر اور وہی دید و شنید اسرار حقیقت کا معائنہ اور مشاہدہ ہے۔

اور مجھے خوشی ہے کہ مرگھٹ و برج خاموش و قبرستان مجھ خاک کا حصہ ہیں۔ اور مجھ خاک کی بیتی میں ان کا شمار رہے۔

میں سب میں ہوں سب مجھ میں ہیں جمادات میں۔ پہاڑ ہیں اور ہر قسم کے جواہرات ہیں مگر وہ سب مجھ سے ہیں اور میں اُن سب کی ماں ہوں۔

نباتات میں ہر قسم کی اُگنے والی چیزیں ہیں۔ مگر وہ بھی سب مجھ خاک سے نکلتی ہیں اور فنا ہونے کے بعد خاک بنجاتی ہیں۔ حیوانات بھی سب خاک سے بنتے ہیں اور مرنے کے بعد خاک ہو جاتے ہیں۔

ان چاروں میں سب سے اعلیٰ انسان ہے۔ وہ بھی مجھ خاک سے نکلتا ہے اور پھر خاک میں سما جاتا ہے۔

تو کیا میں نہ کہوں کہ جمادات بھی خاک، نباتات بھی خاک، حیوانات بھی خاک، اور انسان بھی خاک۔ وہ سب مجھ میں اور میں اُن سب میں۔ نہ وہ غیر۔ نہ میں پرائی۔ نہ وہ تو اور نہ میں اور بھول بھلیاں صورتوں کی ہیں۔ اور صورتیں سب فانی ہیں۔

میری سرگذشت اتنی طویل ہے اور میری زندگی کے اتنے زیادہ واقعات ہیں کہ اگر میں اُن سب واقعات کو لکھواؤں تو دنیا کی ہر طاقت لکھتے لکھتے تھک جائے۔

ذرا خیال کر پہلے تمام کائنات میں پانی تھا اور میں خاک اس کی تہ میں چھپی ہوئی تھی پھر اس پانی کو سمندر میں ہٹا دیا گیا۔ مگر اس کی تہ میں بھی میں موجود ہوں۔ اور پانی کے اندر بے شمار جانور ہیں اور ہر جانور مجھ خاک سے بنتا ہے اور جب مرتا ہے تو پھر میرے اندر سما جاتا ہے۔ سمندر کے اندر پہاڑ بھی ہیں اور درخت بھی ہیں اور دریائی انسان بھی ہیں وہ سب بھی مجھ خاک سے بنتے ہیں اور پھر میرے ہی اندر جذب ہو جاتے ہیں۔ میں خاک کبھی سمندر کی تہ میں پاؤں جما کر بیٹھتی ہوں اور کبھی سمندر کے چہرہ پر موجوں

میں لہراتی ہوں۔ جتنے کنارے سمندر کے ہیں وہ بھی سب مجھ ہی سے بنے ہیں۔ اور کنارو ں کے باہر لاکھوں میل کی خشک زمین میں سوائے میرے اور کوئی چیز موجود نہیں ہی۔ خوبصورت پھول مجھ سے نمودار ہوتے ہیں۔ بلبل اُن سے عشق بازیاں کرتے ہیں۔ کہیں وہ پھول خوبصورت گردنوں کے ہار بنتے ہیں۔ اور کہیں وہ پھول مرنے والوں کے مزار پر چڑھتے ہیں۔ اور خیال کر کہ ہر ایک واقعہ میں ایک زندگی ہی اور ایک بیتی ہی۔

سانپ اور سب موذی جانور میرے اندر سوراخ کرکے گھر بناتے ہیں۔ انسانی گھروں میں رہنے والے چوہے بھی جنگل میں بل بناکر مجھ میں رہتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کا بادشاہ شیر بھی میرے اندر رہتا ہی۔ اور میں ان سب کو اپنے اندر پناہ دیتی ہوں۔

انسان بڑے بڑے محل اور قلعے بناتا ہی۔ کس چیز سے؟ مجھ خاک سے۔ کہ اینٹ خاک سے بنی۔ چونہ خاک سے بنا۔ لوہا لکڑی خاک سے نکلے۔ جس چیز پر بھی تو خیال کرے گا میں تجھکو نظر آؤں گی۔ میں بہروپیہ ہوں۔ ہر مقام پر میرا ایک نیا روپ اور نرالی صورت ہوگی۔ پیپل کہیگا میں پیپل ہوں۔ املی کہیگی میں پیپل نہیں املی ہوں۔ امرود۔ انار۔ آم۔ کیلا۔ ناشپاتی۔ سیب۔ انگور۔ ہر ایک پھل کو اپنی یکتائی کا دعوے ہوگا۔ یہ کبھی بھی خیال نہیں کرے گا کہ پیپل بھی خاک ہے املی بھی خاک۔ امرود۔ انار۔ آم۔ کیلا بھی خاک۔ سیب۔ ناشپاتی انگور بھی خاک۔ دہوکا فقط عارضی شکلوں کا ہی۔ جو بدلتی رہتی ہیں۔ اور مٹتی رہتی ہیں۔

بنی امیہ کا ایک بادشاہ تھا۔ اور وہ اپنی پیاری لونڈی سے کھیل رہا تھا۔ لونڈی بادشاہ کے حلق میں دور سے انگور پھینکتی تھی۔ اور بادشاہ لونڈی کے حلق میں انگور پھینکتا تھا۔ یکایک قضا آئی اور لونڈی کے حلق میں انگور پھنس گیا۔ سانس رُکا اور وہ مرگئی۔ اور بادشاہ اس کے غم میں مرگیا۔ تو بتا بادشاہ کون تھا اور لونڈی کون تھی۔ اور انگور کون تھا۔ یہ بھی خاک وہ بھی خاک۔ ہر ایک خاک۔

ایک بھولی بھالی نور کے سانچہ میں ڈھلی۔ ناز کی گود میں پلی۔ چاندسی صورت من موہنی مورت نور جہاں نامی لڑکی باغ میں کھڑی تھی۔ شہنشاہ اکبر کا ولی عہد نونہال خوش اقبال۔ میرزا سلیم جو بعد میں شہنشاہ جہانگیر مشہور ہوا۔ دو کبوتر ہاتھ میں لیئے ہوئے آیا۔ اور نور جہاں کو کبوتر دیئے کہ انکو پکڑے رہو میں پھول

توڑلوں۔ نورجہاں کے ہاتھ سے ایک کبوتر پھڑ پھڑا کر چھوٹ گیا اور اُڑ گیا۔ سلیم پھول توڑ کر آیا۔ اور اپنے ایک کبوتر کو نہ پایا۔ تو پوچھا وہ کیا ہوا۔ نورجہاں بولی۔ صاحب عالم۔ وہ اُڑ گیا۔ جہانگیر نے کہا کیونکر اُڑا۔ نورجہاں نے دوسرا کبوتر اُڑا دیا اور بولی۔ صاحب عالم۔ یوں اُڑ گیا۔ جہانگیر اس ادا سے بیتاب ہوگیا اور اس کے دل پر اس بات کا ایسا زخم لگا کہ بادشاہ ہونے کے بعد نورجہاں کو بیوی بنایا۔ اور ساری سلطنت اس کے حوالہ کردی۔

جہانگیر کون تھا۔ خاک۔ نورجہاں کون تھی۔ خاک۔ کبوتر کون تھے خاک وہ مہین اور سریلی آواز جو نورجہاں کے حلق سے نکلی۔ خاک سے پیدا ہوئی تھی۔ اور وہ آنکھیں جنہوں نے نورجہاں کو دیکھا اور اس کے حسن سے خود بھی زخمی ہوئیں۔ اور جہانگیر کے دل کو بھی زخمی کیا۔ وہ کس سے بنی تھیں۔ خاک سے۔

ایک آباد مجلس جوان جوان صورتیں اور مورتیں چاروں طرف جمع۔ بیچ میں فانوس کے اندر شمع روشن۔ شراب وکباب کا دور۔ باجوں کی آوازیں۔ سُر بھی مست۔ اور سرور میں بھی ہستی۔ ٹھنڈی ہوا چلی۔ سب شرابی مدہوش ہوگئے۔ بے خبر سو گئے۔ شمع اکیلی چُپ چاپ کھڑی روتی رہی۔ پروانے شمع کے رخ پر قربان ہونے کے لئے جوق جوق آتے تھے اور جل کر مرجاتے تھے۔ صبح ہوئی شرق کے اُفق پر صبح کا ستارا جھل مل جھل مل کرتا ہوا نمودار ہوا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ کچھ انسان فرش پر الٹے سیدھے بیخبر پڑے سوتے ہیں شمع جھلملا رہی ہے اور دم توڑ رہی ہے۔ پروانوں کی لاشیں چاروں طرف پڑی ہیں۔ کسی کا سر جلا ہے کسی کا پر جلا ہے۔ کسی کے ہاتھ پاؤں سوختہ ہوئے ہیں۔ تارے نے یہ غمناک منظر دیکھا۔ تو آنسو بھر لایا۔ شمع کی آخری حالت اور سکرات کا وقت اس سے بھی نہ دیکھا گیا۔

یہ انسان سب خاکی تھے شمع کا موم بھی خاکی تھا۔ شمع کی بتّی بھی روئی کی بنی ہوئی خاکی تھی۔ وہ مرنے جلنے والے پروانے بھی خاکی تھے۔ یہ جلنا مرنا ایک بہانہ تھا۔ شمع تھی نہ پروانہ تھا۔ تارہ کو خواہ مخواہ رلانا تھا۔ مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ کسی کو کچھ دکھانا تھا۔ اور مجھکو یہ سنانا تھا کہ میں خاک ہوں اور میرا ہی ایک افسانہ نہیں بیشمار افسانے ہیں۔

۹، ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ ۲۰ جون

راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستان میں اور افریقہ کے صحرائے اعظم میں ریت کے ٹیلے پہاڑوں جیسے اونچے ہوتے ہیں۔ اور قدرت نے انکو ایک جگہ پہاڑوں کی طرح قید کرکے نہیں رکھا۔ وہ ہوا کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں۔ ابھی یہاں صاف اور چٹیل میدان تھا۔ ہوا چلی اور ذرے دوڑ دوڑ کر آنے لگے۔ ہوتے ہوتے ایک بڑا اونچا پہاڑ سا ٹیلا تیار ہو گیا۔ یہ خاک صاف و شفاف جگمگاتے ذروں کا مجموعہ ابھی یہاں ٹیلہ کی شکل میں نمودار ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہاں سے اُڑیگی اور کسی دوسری جگہ اس کا ٹیلہ بن جائیگا۔

سورج گرماتا ہے تو یہ خاک آگ بنجاتی ہے۔ رات آتی ہے اور خنکی اپنے ساتھ لاتی ہے تو ان ٹیلوں کو ٹھنڈا برف بنا دیتی ہے۔

یہ ٹیلے اور ذرات خاک کے انبار بڑے خونی ہوتے ہیں۔ بے شمار جانور اور آدمی اُنکے نیچے دب جاتے ہیں اور مرکے رہ جاتے ہیں۔ لمبی لمبی ٹانگوں اور گردنوں کے اونٹ اور اُن پر سوار ہونے والے آدمی رات کو صاف میدان میں سوتے ہیں یکایک ہوا چلتی ہے اور کوئی ٹیلہ دوڑا ہوا آتا ہے اور ان اونٹوں اور آدمیوں پر سوار ہو جاتا ہے اور یہ سب ٹیلہ کے نیچے دبکر دم گھٹنے سے مرجاتے ہیں اور بغیر کسی دوسرے کی امداد کے خود بخود قبر میں دفن ہو جاتے ہیں۔ پھر خاک ان کے بدن اور ان کی ہڈیاں رفتہ رفتہ اپنے اندر جذب کرلیتی ہے۔ اور جس خاک سے یہ بنے تھے آخر کار اُسی خاک کی صورت بنجاتے ہیں۔

یہ ہے مجھ خاک کی سقائی اور جسلادی۔ افریقہ کے ریگستان میں ہزاروں میل تک میرے ذرّوں کے سوا نہ کوئی درخت نظر آتا ہے نہ انسان نہ حیوان۔ نہ سڑک نہ مکان وہاں میرے اوپر نہ کوئی چلنے والا ہے نہ مجھپر کوئی گندگی ڈالنے والا ہے۔ اور وہاں میں انسانوں کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہوتی ہوں۔ میرے ذروں کے چہرے نہایت صاف شفاف اور ان میں زندگی کی امنگ بھری ہوئی۔ بس وہ سورج کی کرنوں اور ہوا کے جھونکوں سے رات دن کھیلتے رہتے ہیں۔

۱۰، ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ

ذرا دیکھو اس خاک کو۔ جس پر انسان اور حیوان راستہ چل رہے ہیں۔ گھوڑے گدھے۔ بیل۔ ہاتھی۔ خچر۔ اونٹ راستہ کی اس خاک پر لید کرتے ہیں۔ اور

پیشاب ڈالتے ہیں۔ اور اپنے پیروں سے روندتے ہوئے چلتے ہیں۔ انسان بھی اس خاک کو ہر وقت پامال کرتا رہتا ہے۔

یہ خاک اسی ریگستان کی ہم جنس ہے جو بڑے بڑے قد و قامت کے انسانوں اور حیوانوں کو ایک جھونکے میں اپنے اندر دبا کر فنا کر ڈالتی ہے۔ مگر یہاں خود پامال ہے ذلیل و خوار ہے۔ اور ہر ادنیٰ اعلیٰ انسان و حیوان اس کو نہایت ذلت و حقارت کے ساتھ روند رہا ہے اور پامال کر رہا ہے۔ اور اس پر ہر قسم کی گندگی ڈال رہا ہے۔ مگر یہ خاک اُف نہیں کرتی۔ چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔

لیکن گرمی کے موسم میں اس خاک کو بھی غیرت آتی ہے اور وہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے اپنی فریاد لیجاتی ہے۔ کہ مجھکو اتنا ذلیل کیوں بنا دیا گیا کہ تیری ہر مخلوق مجھکو روندتی اور کچلتی ہوئی چل رہی ہے۔

خاک کی یہ بات سنکر قدرت کو جلال آتا ہے۔ وہ آندھی کو اس خاک کے پاس بھیجتی ہے اور آندھی اس پامال خاک کو اپنے بازوؤں پر بٹھاتی ہے۔ اور ہوائی جہاز سے زیادہ تیزی کے ساتھ اُڑتی ہے۔ اور اس خاک کو لیکر اُن جانوروں کی آنکھوں اور کانوں اور ناک میں گھس جاتی ہے۔ جو اس پر پیشاب پیخانہ کرتے تھے اور جو اس کو روندتے تھے۔ اور اُن انسانوں کو بھی جو اس خاک کو پامال کر رہے تھے۔ اس پامال خاک کی یورش کا مزا آجاتا ہے۔ کیونکہ یہ خاک اُن آدمیوں کے کانوں اور آنکھوں اور ناک میں بھی گھس جاتی ہے اور ان کے چھپروں کو بھی اُڑا دیتی ہے اور ان کی کوٹھیوں اور بنگلوں اور مکانوں کے کواڑ توڑ ڈالتی ہے۔ اور انکی روشنی کے لیمپ بجھا دیتی ہے۔ اور ان کی سواریوں۔ موٹروں اور بگیوں کو اُلٹ دیتی ہے اور تار برقی کے تار بھی توڑ ڈالتی ہے۔ درصل یہ سب کام ہوا کرتی ہے۔ لیکن ہوا کے اوپر خاک سوار ہوتی ہے۔

کل سے قربانیاں ہو رہی ہیں۔ لاکھوں کروڑوں جانور خاک پر لٹائے جاتے ہیں اور چھریوں سے اُن کے گلے کاٹے جاتے ہیں۔ جگہ جگہ اُن جانوروں کا خون میرے اوپر بہہ رہا ہے۔ کہیں میں اس خون کو پی جاتی ہوں اور کہیں اس خون کو نہیں پیتی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں قربانی کرنے والوں کو بتایا تھا کہ خدا کو تمہاری قربانیوں کے گوشت اور خون کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو تمہاری پرہیز گاری کو

۱۱ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ

چاہتا ہے لیکن انسان ایسے بھی ہیں جو محض اس خیال سے قربانیاں کرتے ہیں کہ قربانی کے جانوروں کا خون اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بطور نذر کے پیش ہو۔ میں اس نذر کے خون کو اپنے ذریعہ پیش کرتی ہوں۔ جانور کی رگوں سے خون اچھلتا ہوا، ابلتا ہوا، دوڑتا ہوا گرما گرم مجھ خاک کے چہرے پر گرتا ہے۔ اور میں اس کو پی جاتی ہوں۔ یہ خون خدا کی نذر ہو یا نہ ہوا اور خدا اس کو قبول کرے یا نہ کرے۔ لیکن میں آدمی کے بہائے ہوئے اس خون کو قبول کر ہی لیتی ہوں۔ قربانی کا جانور میرے اوپر لٹایا جاتا ہے اور چھری چلنے کے بعد میرے ہی اوپر وہ تڑپتا ہے۔ ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اور خر خر کرکے اپنے خون کے فوارے مجھ پر چھوڑتا ہے۔

وہ جانور بھی خاک ہے۔ اس کا خون بھی خاک ہے اور جس چھری سے اس کا گلا کٹا وہ بھی خاک سے نکلے ہوئے لوہے کی ہے۔ چھری چلانے والا بھی خاک ہے اور چھری چلوانے والا بھی خاک ہے۔ مگر کہنے والے کہتے ہیں بقرعید آئی۔ ہم نے قربانیاں کیں اور مذہبی حق ادا ہو گیا۔ کوئی شخص خاک کے ان تماشوں کا اور ان نیرنگیوں کا خیال بھی نہیں کرتا۔ لو بس میں اپنی بیتی کو ختم کرتی ہوں۔ ختم خاک۔

لوہا

انسان جمادات کی بیتی سن رہا ہے۔ میں لوہا بھی جمادات میں ہوں۔ میں نے کہا تھا۔ جمادات میں پہلے سونے کا ذکر ہو۔ پھر چاندی کا پھر اور خوبصورت دہاتوں کا اس کے بعد آخر میں مجھ کالے کلوٹے لوہے کا نمبر آنا چاہیئے۔ لیکن خاک نہ مانی اور اس نے سب سے پہلے اپنی بیتی سنانی شروع کر دی۔ اس کا کہنا ٹھیک ہے کہ وہ سب جمادات اور سب نباتات اور سب حیوانات اور سب انسانوں کی ماں ہے۔ ہم سب اسی سے نکلتے ہیں اور اسی میں سما جاتے ہیں۔

سونے چاندی اور خوبصورت دہاتوں کا تذکرہ پہلے ہونا ضروری تھا۔ اور ان سے بھی پہلے ہیرے۔ زمرد۔ لال۔ اور ان سب جواہرات کا حال آنا چاہیئے تھا۔ جو جمادات میں سب سے زیادہ قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر انسان نہ مانا۔ اور اس نے کہا کہ اے لوہے! جس زمانہ میں کائنات کی اشیا اور کائنات کی

موجودات اپنا حال سنا رہی ہیں۔ اس زمانہ میں نہ ہیرے کی اتنی ضرورت ہے۔ نہ زمرد کی نہ لال کی۔ اور نہ سونے چاندی کی جتنی ضرورت تجھ لوہے کی ہے۔ اور جتنا کام تجھ لوہے سے لیا جاتا ہے۔ اور جتنے کثیر حالات تجھ لوہے کے ہیں۔

ہیرا بے شک قیمتی ہے۔ بہت سفید اور بہت چمک دار ہے۔ لیکن صرف امیروں کے کام آتا ہے۔ انگوٹھیوں میں جڑا جاتا ہے۔ یا گلے کے زیورات میں نظر آتا ہے۔ لال اور زمرد کا بھی یہی حال ہے۔ اور جتنے جواہرات ہیں اُن سب کا بھی یہی کیفیت ہے کہ اُن کے قدردان محدود ہیں اور اُن کے کام بھی محدود ہیں۔ تجھ لوہے کی برابری نہ جواہرات کر سکتے ہیں۔ نہ چاندی سونا۔ اس واسطے پہلے تو ہی اپنا حال سنا۔ اور خاک کے بعد تو ہی اپنی بیتی کہنے کے لئے سامنے آ۔

میں لوہا۔ کالا کالا۔ خوب مضبوط۔ خوب ٹھوس۔ خوب بھاری پتھر کے جگر سے خاک کے پیٹ سے نکلا ہوا۔ مجھکو آگ میں گرم کرکے ذرّاتِ خاک سے جُدا کیا گیا اور میں کائنات کے میدان میں قائم ہو کر اور ایک مستقل صورت اختیار کرکے آ گیا۔

میری بیتی دو قسم کی ہے۔ ایک پُرانی اور ایک نئی۔ پہلے میں اپنی پُرانی بیتی سناتا ہوں۔ اس کے بعد نئی بیتی سناؤں گا۔ اور انسان کو وہ اطلاعیں دوں گا جو اگرچہ پہلے سے اُس کے علم میں ہیں لیکن وہ کبھی ان پر غور نہیں کرتا کہ میں کیا تھا اور میں کیا ہوں اور میں نے دنیا میں کیا کیا کام کیئے ہیں۔

میری پُرانی بیتی سننے سے پہلے سننے والوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں اور اس کائنات میں میں نے سب سے زیادہ جو کام کیا اور جس ذریعہ سے کیا اور جس صورت میں کیا۔ پہلے میں اُسی کام کو بیان کروں گا۔ کان لگا کر سنو۔

تلوار۔ میری پُرانی بیتی میں سب سے بڑا درجہ تلوار کا ہے۔ اُس کے بعد تیر ہیں۔ برچھے ہیں۔ چھریاں ہیں۔ زرہ بکتر ہیں۔ اور اسی قسم کے اور سب ہتھیار ہیں جو مجھ سے بنائے جاتے ہیں۔

اُسی پُرانے زمانہ میں تو پیں بھی مجھ سے بننی شروع ہوگئی تھیں اور جہازوں کی تعمیر بھی مجھ سے ہوتی تھی۔ اور انسان اپنے مکانوں میں بھی مجھ سے کام لیتا تھا۔ اور آئینے بھی مجھ سے بنائے جاتے تھے۔ اور کپڑے بھی میری سوئی سے سیئے جاتے تھے لیکن

سب سے زیادہ میری ضرورت ہتھیاروں میں ہوتی تھی۔ اور ہتھیاروں میں بھی مجھ لوہے سے تلواریں ہی زیادہ بنتی تھیں۔ اس واسطے میں تلوار بیتی کو سب سے مقدم رکھتا ہوں۔

اگر میں یہ کہوں کہ سب سے پہلے آدمی نے مجھ لوہے کے ذریعہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنا شروع کیا تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کیونکہ قتل و خونریزی کی ابتدا میرے ذریعہ سے نہیں ہوئی بلکہ پتھر کے ذریعہ سے ہوئی کہ جب آدم کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل میں لڑائی ہوئی تو ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو پتھر سے ہلاک کیا لوہے کے کسی ہتھیار سے اس زمین پر پہلا قتل نہیں ہوا۔

تلوار ایک گز یا اُس سے کچھ کم یا اُس سے کچھ زیادہ لمبی لوہے کی بنی ہوئی دھار دار ایک چیز ہوتی ہے۔ کوئی اس کو ٹیڑھا بناتا ہے کوئی سیدھا۔ کوئی چھوٹا بناتا ہے کوئی بڑا۔ اور جو قوم سب سے زیادہ تلوار کی قدر کرتی ہے اس کی شناخت، اُس کی بولی اور زبان سے کی جاتی ہے۔ یعنی جس قوم کی زبان میں تلوار کے لیے سب سے زیادہ الفاظ ہوں وہی قوم سب سے زیادہ اُس کی قدردان ہے۔ اور عربی زبان میں تلوار اور اونٹ کے لئے سب سے زیادہ الفاظ ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب قوم تلوار کی سب سے زیادہ قدردان ہے۔

تلوار کسی قوم کی اور کسی شخص کی دوست نہیں ہے۔ بلکہ جس کے ہاتھ میں اس کا قبضہ ہو اُسی کے کام آتی ہے۔ تلوار اور گھوڑا اور عورت تین چیزیں بے وفا مانی گئی ہیں کہ جس کے قبضہ میں جاتی ہیں اُسی کی بن جاتی ہیں۔ لیکن گھوڑا اور عورت تلوار سے زیادہ بے مروت نہیں ہیں۔ ان کو اپنے قدیمی مالک کا تھوڑا بہت لحاظ ہوجاتا ہے۔ لیکن تلوار بڑی بے مروت ہے۔ ایک سکنڈ کے اندر بدل جاتی ہے۔ ابھی کالے کے ہاتھ میں تھی گورے کی جان لینی چاہتی تھی۔ ابھی گورے کے ہاتھ میں چلی گئی تو فوراً کالے کی جان لیوا ہوگئی۔

میدان جنگ میں اگر اپنے مالک کے ہاتھ سے گر پڑے اور دشمن اس کو اُٹھا کر اس کے پہلے مالک پر چلائے تو فوراً اپنے سابق مالک کا سر کاٹنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

میں تلوار کی بیتی کیا کہوں۔ خود تلوار سے پوچھو وہی اپنا حال سُنائے گی۔

میں تیغ ہوں میں شمشیر ہوں میں سیف ۔ میں تلوار ۔ میں آب دار ۔ میان میں چھپکر رہنے والی ۔ میدان میں چمک کر نکلنے والی ۔ میں سروں پر بلند ہوتی ہوں ۔ میں سروں پر گرتی ہوں اور کاٹتی ہوئی سینہ تک آجاتی ہوں ۔ میں گردن پر پڑتی ہوں تو سر تن سے جدا کرڈالتی ہوں ۔ میں ہاتھ کاٹتی ہوں ۔ میں پاؤں کاٹتی ہوں ۔ میں پیٹ پھاڑتی ہوں ۔

جب میں چلتی ہوں ۔ اور میان سے نکلتی ہوں تو میدان جنگ میں چکا چوند ہوجاتی ہے ۔ میں جب لوہے کی زرہ اور خود پر پڑتی ہوں تو مجھ سے ایک جھنکار پیدا ہوتی ہے ۔ کبھی میں ٹوٹ جاتی ہوں ۔ کبھی میں کُند ہوجاتی ہوں ، اور کبھی زرہ اور خود کو بھی کاٹ ڈالتی ہوں ۔ مجھ کو زہر میں بجھا لیا جائے تو میں کالی ناگن سے بھی زیادہ زہریلی ہوں ۔ اگرچہ میرا رنگ ظاہر میں سفید ہوتا ہے مگر میں اندر سے سیاہ اور بڑی ہی کٹیلی ہوں ۔ میرا عقیدہ ہے کہ بندوق ڈرپوک ہے ۔ منافق ہے چھپ کر آڑ لیکر دغا اور دھوکے سے وار کرتی ہے ۔ سچے مردوں کا ہتھیار میں ہوں آمنے سامنے کی کھری اور سچی سچی بات میری ہوتی ہے ۔

جس کسی نے کہا بالکل سچ کہا کہ جس کی تیغ اُس کی دیغ ۔ میں جس کے قبضہ میں ہوتی ہوں اور جو مجھکو چلانا جانتا ہے اور جو مجھ پر بھروسہ کرتا ہے دنیا کا تاج و تخت اور دولت اور چاندی سونا اور جواہرات اور ہر قسم کے اختیارات اُسکے قبضہ میں آجاتے ہیں ۔ اسی واسطے میں کہتی ہوں کہ لوہا سب سے زیادہ قیمتی ہے کہ جس کے پاس لوہے کی تلوار ہے سونا چاندی اور ہر قسم کے جواہرات کا اُسی کے سامنے انبار ہے ۔ لوہے کی تلوار آقا ہے اور سونا چاندی اور جواہرات کے انبار اس آہنی ٹکڑے کے لونڈی غلام ہیں ۔

میں اگرچہ آبدار ہوں لیکن جب کسی گلے پر چلتی ہوں تو وہ پانی مانگنے لگتا ہے ۔ اور اُس کی پیاس بڑھ جاتی ہے ۔ گویا میری آب پیاسوں کی پیاس نہیں بجھا سکتی بلکہ لوگوں کو پیاسہ بنا دیتی ہے ۔

مجھکو میان کے پردے میں اسی واسطے رکھتے ہیں کہ میں بے وفا اور بے مروّت ہوں ۔ جس کے قبضہ میں جاتی ہوں اُسی کی ہوجاتی ہوں ۔ اور عورت کو

بھی اسی واسطے پردے میں رکھا جاتا ہے کہ وہ بھی جس کے قبضہ میں جاتی ہے اُسی کی بن جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تلوار کا گھونگٹ اور عورت کا گھونگٹ بول چال میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔

مجکو گلاب سے صاف کیا جائے یا پیشاب سے مجھے اس سے کچھ بحث نہیں۔ میرا زنگ دور ہو ہی جاتا ہے۔ میں مخملی میان میں رہوں سنہری روپہلی قبضہ مجھ پر لگایا جائے یا معمولی چمڑے لکڑی کا میان ہو یا ادنےٰ قسم کا قبضہ ہو مجھے اس سے کچھ بحث نہیں۔ میری کاٹ ہر حال میں یکساں رہتی ہے مخملی میان سے نکلتی ہوں تب بھی ہلاک اور زخمی کرتی ہوں اور ادنےٰ درجہ کے میان سے نکلتی ہوں تب بھی میرے کام میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

مجکو مظلوموں کی حمایت کے لیئے بنایا گیا تھا۔ مگر ظالموں کے ہاتھ میں کام کرتی ہوں۔ مجکو درندوں کی ہلاکت اور انسانی بچاؤ کے لیئے بنایا گیا تھا۔ مگر درندے انسان اپنے ہی بھائیوں کو مجھ سے قتل کرتے ہیں۔ باپ اپنی اولاد کو۔ اولاد اپنے ماں باپ کو۔ بھائی اپنے بھائیوں کو۔ خاوند اپنی بیویوں کو۔ بیویاں اپنے شوہروں کو محض دنیا کی دولت اور دنیا کی حکومت کے لیئے میرے ہاتھوں ہلاک کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ دولت اور حکومت تو میری لونڈیاں ہیں۔ اگر مجھے اچھے کاموں میں استعمال کیا جائے تب بھی دولت اور حکومت سے وہ محروم نہیں ہوں گے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا" الجنۃ تحت ظلال السیوف " (جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے) یعنی جو لوگ کفر و انکار اور جفا اور دغا اور ظلم و ستم کو تلوار کی دھار سے صاف کرنا چاہتے ہیں اُن کو جنّت دونوں جہان میں ملتی ہے۔ اس حدیث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تلوار کے ذریعہ ظلم اور سفاکی اور جلادی کرنے والے بھی جنت حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ بادشاہوں کے نوکر ہوتے ہیں اور بادشاہوں کے حکم سے جلادی کا کام کرتے ہیں اور گنہگاروں کا سر اپنی تلواروں سے کاٹتے ہیں انہیں اُن کی تلوار کے ذریعہ صرف روٹی ملتی ہے۔ دولت اور حکومت اُن کو حاصل نہیں ہوتی جو تلوار کی

۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ

لونڈی ہیں۔ کیونکہ جلاد اپنے اختیار اور اپنے حکم اور اپنی مرضی سے یہ تلوار نہیں چلاتے۔ اس واسطے اس جلادی کا نہ انہیں کچھ گناہ ہوتا ہے اور نہ کچھ ثواب مل سکتا ہے۔ تلواروں کا سایہ تو اُن کے لیے جنت ہے جو تلوار کو اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے حق اور انصاف کے لیے چلائیں اور کفر اور سرکشی کو مٹائیں اور ظالموں کے ہاتھ سے مظلوموں کی جان مال اور آبرو کو بچائیں۔ کہ سلطنت تلوار کی قوت سے ملتی ہے۔ اور سلطنت کا اصلی مقصد یہی ہے کہ اس کے انتظام کے ذریعہ ظالموں کے ہاتھ سے مظلوموں کو بچائے۔ اور رعایا کے حقوق اور جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے۔ اور کوئی سلطنت تلوار کی قوت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اور کوئی سلطنت انصاف اور انتظام کے بغیر جنت نہیں بن سکتی۔

جن لوگوں نے اس تلوار سے بے گناہ پیغمبروںؑ کے سر کاٹے یہ تلوار اُن کے لئے جنت نہیں ہے۔ یزید کی فوج نے حضرت امام حسینؑ اور ان کے بچوںؓ کے اور ساتھیوں کے سر تلوار سے کاٹ ڈالے۔ ایسی تلوار کو اور اُس کے سایہ کو جنت سے کچھ سروکار نہیں ہے۔

میں تلوار نمرود کے ہاتھ میں بھی تھی۔ اور مجھ تلوار پر فرعون اور ہامان کا بھی قبضہ تھا۔ اور میں ہی وہ تلوار ہوں جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسےؑ کے ہاتھ میں تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نمرود و فرعون و ہامان کی تلواروں کے نیچے دوزخ تھی اور موسےؑ اور ابراہیمؑ کی تلواروں کے نیچے جنت تھی۔ کیونکہ نمرود و فرعون و ہامان ان تلواروں سے باطل اور خود پرستی اور ظلم و ستم کی حمایت کا کام لیتے تھے۔ اور ابراہیمؑ اور موسےؑ کی تلواریں ان کے برعکس کام کرتی تھیں۔

"تیر و تبر" اور "برچھی و خنجر"

میں تیر ہوں۔ لوہے کا بنا ہوا۔ بازو کی قوت سے کمان کھنچتی ہے اور کمان کے چلّہ کی قوت سے میں چلتا ہوں۔ اور ہر انسان و حیوان کو ایک ہی وار میں بیکار کر دیتا ہوں۔ مگر اب میرا رواج کم ہوگیا۔ بلکہ گم ہوگیا۔ میری جگہ پستول اور بندوق نے لے لی۔

میرا وار بازو کی قوت اور کمان کی قوت سے کارگر ہوتا تھا۔ مغل قوم اور عرب

قوم اور ہندوستان کی راجپوت اور بھیل قوم میرے فن میں شہرہ آفاق تھیں - فارسی اور اُردو شاعری میری تعریفوں سے لبریز ہے - مجکو خوبصورت آنکھوں کی دیدے تیر نظر' کہکر مشابہت دیجاتی ہے - میری ہی شان میں کہا گیا ہے ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

میں اگرچہ لوہے کا بنتا ہوں لیکن بعض قومیں لکڑی کے تیر بھی بناتی ہیں - اور کام دونوں کا یکساں ہوتا ہے - میری ہیتی تلوار کے بعد پُرانے زمانہ میں سب سے زیادہ شاندار ہے - میں نے بھی بے گناہوں اور گنہگاروں دونوں کے سینے اپنی نوک سے زخمی کیئے - حالانکہ مجکو بھی تلوار کی طرح مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سزا کے لیئے بنایا گیا تھا -

مجکو نشانہ سے بہت تعلق ہے جس کا نشانہ درست ہوتا ہے میں اُسی کا کام کرتا ہوں - اور جب میرا نشانہ خطا ہو جاتا ہے تو میں تیر انداز کی جان کے لیئے اُلٹا وبال ہوجاتا ہوں - سلطان الپ ارسلان بڑا مشہور تیر انداز تھا - اس کے تیر نے نشانہ سے کبھی خطا نہیں کی تھی - لیکن ایک دن بھرے دربار میں ایک باغی مجرم کو لائے - اور الپ ارسلان نے اپنے ہاتھ سے اُس کے سینہ پر تیر مارا - مگر تیر نے خطا کی اور قبل اس کے کہ الپ ارسلان دوسرا تیر باغی کے مارتا باغی خنجر لیکر دوڑا اور اس نے الپ ارسلان کے سینہ پر خنجر مارا - اور الپ ارسلان اُس کے صدمہ سے مر گیا -

تبر:- میں ایک معمولی ہتھیار ہوں - تیر سے ایک نقطہ میں کم ہوں اور کام میں تیر کی بہ نسبت بہت ہی زیادہ کم ہوں - میرا شکریہ قبول کیجئے کہ مجھے تیر کے بعد جگہ دیدی گئی - میں لوہے کا ہوں - اور کاٹنا اور زخمی کرنا میرا کام ہے -

برچھی:- بانس میں لگا ہوا لوہے کا پھل - نوکدار - چمکیلا - سینہ پر لگ کر پشت سے بار نکل جانے والا - آنکھ پر لگ کر آنکھ کو پھوڑ ڈالنے والا ایک معمولی ہتھیار ہوں - میں نے لوہے سے کہا تھا کہ تلوار کے بعد میرا نمبر ہونا چاہیئے اور میرے بعد تیر کا اور تیر کے بعد خنجر کا اور خنجر کے بعد تبر کا اور اُس کے بعد اور ہتھیاروں کا - مگر میرا کہنا کسی نے نہ سُنا اور ہتھیاروں کے فرق مراتب کو نظر انداز کر دیا گیا - لوہے نے مجھے جواب دیا کہ چونکہ

آجکل تلوار اور خنجر اور تیر تبر اور برچھی کا زمانہ نہیں ہے اور انسان ان ہتھیاروں کے استعمال کو بھول گئے ہیں اور کوئی شخص ان ہتھیاروں کے مدارج اور مراتب سے واقف نہیں ہے۔ اس واسطے کوئی حرج نہیں کہ پہلے تیر کا نام آئے یا تبر کا یا خنجر کا یا برچھی کا۔ میں خاموش ہوگیا مگر میں ناراض بھی ہوگیا۔ مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنی بیتی سُناتو میں کہتا ہوں کہ میری بیتی بس یہی ہے کہ میں نے ہمیشہ سینہ اور دل اور انسانی جسم اور حیوانی جسم زخمی کیئے۔ اور جس ہاتھ نے مجھے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ میں اُسی کے ہاتھ کا غلام بن گیا۔

البتہ مجھے بطور فخر کے یہ کہنا ہے کہ حضرت علیؑ شیر خدا نے ایک شعر میں میرا بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے ؎

جراحات السنان لها التیام
ولا یلتام ما جرح اللسان

برچھیوں کے زخم اچھے ہوجاتے ہیں لیکن زبان کے لگائے ہوئے زخم اچھے نہیں ہوتے۔

اس شعر میں بالکل سچی بات کہی گئی ہے کہ مجھ برچھی کا زخم بھر جاتا ہے۔ مگر بدزبانی کا زخم نہیں بھرتا۔

عربی زبان میں مجھ برچھی کے وار کو "طعن" کہتے ہیں۔ اور اسی واسطے بد زبانی کے وار کو بھی "طعنہ" کہا جاتا ہے۔ جس کا زخم نہیں بھرتا۔

میرا کام اور میری بیتی شروع سے آخر تک محض یہ ہے کہ میں نے ظلم و عدل اور حق و ناحق کا امتیاز کیئے بغیر انسانوں کے ہاتھوں میں جاکر بے شمار اور لاتعداد کلیجے اپنی نوک سے زخمی اور چھلنی کر ڈالے۔

خنجر:- میں بھی لوہے کا ہوں۔ تلوار سے چھوٹا۔ مگر بڑا ہی کھوٹا۔ سینہ اور دل اور جگر پر زخم لگاتا ہوں۔ حلق بھی کاٹتا ہوں۔ موت سے میری بڑی دوستی ہے۔ خنجر آبدار میرا نام ہے۔ چمک دمک کے سبب مجھے آبدار کہتے ہیں۔ لیکن مجھ سے جو شخص گلے ملتا ہے اُس کی پیاس بڑھ جاتی ہے۔ چھری اور چھرا میرے قریبی رشتہ دار ہیں اور یہی بہت سے ہتھیار۔ سنگین۔ کھکری۔ کٹار۔ جنبیہ۔ پیش قبض۔ میرے خاندان میں ہیں۔ اور انہیں

ہر ایک انسانوں کی کسی نہ کسی قوم کا محبوب و مطلوب ہے۔
اللہ تعالیٰ نے میری جنس کو پیدا کیا۔ تو اُس کے کام تقسیم کر دیئے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ میری جنس۔ لوہے کے اچھے اچھے کام بھی ہوتے ہیں تو مجھے قلق ہوتا ہے کہ میرے ذمہ قتل و خونریزی کا کام کیوں لگایا گیا ہے۔
زہر کو ہلاکت کی قوت دی۔ تو اس میں تندرستی اور جسمانی قوت بڑھانے کی ... ... خاصیت بھی رکھی کہ جب آدمی مقررہ تعداد سے کم تعداد میں زہر کھاتا ہے تو وہ زہر اُس کے لئے مقوی ہو جاتا ہے۔ اور جب مقررہ مقدار کی حد سے تجاوز کرتا ہے۔ تو وہ زہر اُس کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔
میں لوہے کا ایک ٹکڑا ہوں۔ اگر خنجر کی صورت میں نہ بنایا جاتا بلکہ مجھ سے قلم تیار ہوتے تو انسانوں کے لئے بہت مفید ہوتا۔ مگر تقدیر سے خنجر بن گیا۔ اب گلے کاٹتا ہوں۔ اور دل و جگر پہ زخم لگاتا ہوں۔ اور دل ہی دل میں کہتا ہوں۔ کاش میں خنجر نہ ہوتا اور گھوڑے کے پاؤں کا نعل بنایا جاتا۔ کہ گھوڑے کو ٹھوکروں سے بچاتا۔ اور خود پامال ہوتا رہتا۔
میری بیتی اور میری سرگذشت بہت طولانی ہے۔ میں ہمیشہ بادشاہوں اور شہنشاہوں اور سپہ سالاروں کی کمر میں رہا ہوں اور بڑے بڑے بہادر میدانِ جنگ میں مجھ سے کام لیتے رہے ہیں۔ مگر الحمدللہ اب خدا نے مجھے ان خونریزیوں سے نجات دیدی ہے آجکل تو عجائب خانوں کی دیواروں پر محض دیکھنے کے لئے لٹکا رہتا ہوں۔ نئے زمانہ کے آدمی دیکھنے آتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ خنجر ہے۔ یہ کٹاری ہے۔ یہ پیش قبض ہے۔ اور انہی سے اگلے وقتوں میں گلے کٹتے تھے۔ اور دل و جگر چیرے جاتے تھے۔
اے انسان! میرا وقت ختم ہو گیا۔ اگرچہ اب میری جنس لوہے کی توپیں اور بندوقیں اور گولے اور گولیاں مجھ سے زیادہ دنیا میں ہلاکت پھیلا رہی ہیں۔ لیکن مجھے مسرت ہے اور میں خدا کا شکرانہ ادا کرتا ہوں کہ میری خونخواری اور خون آشامی کے دن ختم ہو گئے۔
ایک زمانہ تھا کہ تمام دنیا میں تلوار کے بعد میرا ہی نام لیا جاتا تھا۔ اور میری ہی دھاک گھر گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر آج میں ایک کہانی ہوں اور میری بیتی ایک گزرا ہوا قصہ ہے۔

زرہ

لوہے سے بنی ہوں۔ آدمی کا ہتھیاروں کے وار سے بچاؤ کرتی ہوں۔ میں انسان کا آہنی لباس ہوں۔ حضرت داؤد پیغمبر کو یہ معجزہ دیا گیا تھا کہ لوہا اُن کے ہاتھ میں آکر موم بن جاتا تھا۔ اور وہ موم شدہ لوہے سے زرہ بناتے تھے گویا اپنی نیکی اور پیغمبری کی شان دکھلاتے تھے کہ ہتھیاروں کی خونریزی سے انسان کا جسم محفوظ رہے۔

میں لباس کی طرح سر سے پاؤں تک آدمی کے بدن کو چھپا لیتی تھی اور مجھے پہن لینے کے بعد انسان ہر ہتھیار کے وار سے محفوظ ہو جاتا تھا۔

مجھکو پیغمبروں نے پہنا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہوں نے پہنا ہے۔ بڑے بڑے سپہ سالاروں نے پہنا ہے اور سب ہی جنگی سپاہی مجھکو استعمال کرتے آئے ہیں۔ میدان جنگ میں جب دھوپ کی تیزی سے میں گرم ہو جاتی تھی۔ تو مجھے پہننے والا زندہ دوزخ میں اپنے آپ کو سمجھنے لگتا تھا۔ بس یہی ایک عیب میرے اندر تھا یا یہ کہ بعض نازک بدن لوگ میرا بوجھ اُٹھانے سے جلدی تھک جاتے تھے۔

میرا نام زرہ ہے اور بکتر اور چار آئینہ وغیرہ سب میرے ہی کنبہ میں ہیں اور خود بھی میرا رشتہ دار ہے۔ جس کو لڑائی کے وقت سر کے اوپر پہنا جاتا تھا۔ اور مغفر بھی میری قرابت دار ہے جو خود میں لگی رہتی ہے اور انسان کے چہرہ اور گردن کو ہتھیاروں کے وار سے بچاتی ہے۔ مگر اب انسانوں کو نہ میری ضرورت ہے نہ بکتر کی۔ نہ چار آئینہ کی۔ نہ خود کی نہ مغفر کی۔ اب تو دور سے بندوق کی گولی آتی ہے اور انسان کو ہلاک کر ڈالتی ہے اور ساٹھ ساٹھ ستر ستر میل کے فاصلے سے توپ کا گولہ آتا ہے۔ اور بے شمار انسانوں کے پرخچے اُڑا ڈالتا ہے لیکن ابتک کوئی ڈھال اور کوئی زرہ اور کوئی خود اور کوئی بکتر اور کوئی چار آئینہ اور کوئی مغفر توپ بندوق کی حملہ آوری سے بچانے والا نہیں بنا۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ توپ کے منہ سے وعظ بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے اسی مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

شاہ جرمن نے کہا ہنس کر جناب پوپ سے
وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہان توپ سے

اب مجھ زرہ کی زندگی ختم ہوگئی۔ اب تو میں محض آثار قدیم کی چیزوں میں رکھی رہتی ہوں اور عجائب خانوں کی زینت بڑھاتی ہوں۔ لیکن گذشتہ زمانہ میں ہزاروں برس تک میں نے وہ وہ کام کئے ہیں کہ تاریخ کی کتابیں جب مہلک ہتھیاروں کا ذکر لکھتی ہیں تو زرہ بکتر اور خود اور چار آئینہ کا بیان بھی اُن کے ہاتھ لازمی ہو جاتا ہے۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا فخر عطا فرمایا ہے جس کو میں اپنی سرگذشت میں بیان کرنا بہت ضروری سمجھتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی لاڈلی بیٹی سیدہ فاطمہ زہرا کا نکاح اپنے چچا زاد بھائی علی مرتضیٰ سے کرنا چاہا اور اُن سے پوچھا کہ تمہارے پاس اپنی بیوی کا مہر ادا کرنے کے لئے کیا چیز ہے۔ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ میرے پاس صرف ایک زرہ ہے۔ یہ سُنکر رسول اللہ نے فرمایا کہ جاؤ اُس زرہ کو بیچ ڈالو اور اس سے اپنی ہونے والی بیوی کے مہر کا انتظام کرو۔

چنانچہ میں بکی۔ اور ان نورانی اور روحانی انسانوں کے عقد کا ذریعہ بنی۔ مگر ہائے کہ یہاں تو میں نے پاک کران دو کو ملایا۔ مگر جب ان دونوں سے حسین پیدا ہوئے تو کربلا کی زمین پر حسین کی جان نہ بچا سکی اور یزیدی ہتھیاروں نے رسول کے نور چشم اور فاطمہ کے لخت جگر اور علی کے راحت جان حسین کو خاک اور خون میں ملا دیا اور اس واقعہ نے میری تاریخی آبرو بھی مٹی میں ملا دی۔ افسوس میں نے لاکھوں کی جانیں بچائیں مگر اس کی جان نہ بچا سکی۔ جو رسول اللہ کا جانجاناں تھا۔ علی مرتضیٰ کا جانجاناں تھا فاطمہ زہرا کا جان جاناں تھا۔ اور تمام کائنات کا جان جاناں تھا۔

جب مجھے خیال آتا ہے کہ حسین کے نور نظر علی اکبر کا سینہ کوفی برچھی نے چھیدا تو میں اپنا آہنی سینہ چاک کر ڈالتی ہوں کہ میں نے خاندان نبوت کے گھر کے چراغ کو ظلم و ستم کی برچھی سے نہ بچایا۔ اور جب میں یہ خیال کرتی ہوں کہ کربلا کی دھوپ میں اور تین دن کی بھوک پیاس میں فاطمی سیدوں کے جسم پر میں گرم ہوگئی اور بہت گرم ہوگئی۔ اور میری وجہ سے اُن مظلوموں کی پیاس بڑھ گئی۔ اور تکلیف میں اضافہ ہوگیا۔ تو شرم و ندامت سے پانی پانی ہو جاتی ہوں۔ کاش! لوہا دنیا میں پیدا نہ ہوتا اور کاش! اس لوہے کی زرہیں نہ بنائی جاتیں۔ اور آج مجھے اپنی سرگذشت سنانے کے وقت یہ نہ کہنا پڑتا۔ کہ میں حسین مظلوم اور اُن کے بال بچوں کے لئے کچھ بھی

کام نہ آسکی۔ بلکہ اُن کی اذیت کا باعث بنی۔

ڈھال

گھونگھٹ نگاہوں کے وار سے عورت کے چہرہ کو بچاتا ہی۔ نقاب بھی عورت کے چہرۂ زیبا کی ڈھال ہی۔ مگر میں مرد کے چہرہ کو۔ مرد کے سینہ کو اور مرد کے جسم کو اور مرد کی جان کو مہلک ہتھیاروں کے وار سے بچاتی ہوں۔

میں لوہے سے کم بنتی ہوں۔ مختلف قسم کے چمڑے میری تیاری میں کام آتے ہیں لیکن لوہا بھی مجھپر لگایا جاتا ہی۔ اور بعض لوگ محض لوہے کی بھی ڈھال بناتے ہیں۔ میری سرگذشت صرف اتنی ہی کہ میں ہتھیاروں کی روک ہوں۔ مگر جب تھی جب تھی اب تو محض میرا نام ہی نام لغت کی کتابوں میں رہ گیا ہی۔ کیونکہ آج کل ایسے ہتھیار نکل آئے ہیں۔ جن کی روک کے لئے میں کام نہیں دیسکتی۔

مجھکو ڈھال بھی کہتے ہیں اور سپر بھی کہتے ہیں۔ اردو زبان میں "سینہ سپر" کا مشہور محاورہ میری ہی وجہ سے جاری ہوا ہی۔

لوہے کی نئی بیتی

پرانی بیتی کی چند مثالیں بیان کردیں۔ اب اپنے ہتھیاروں کی کچھ نئی مثالیں بیان کرتا ہوں۔

توپ کئی سو برس سے مجھہ لوہے کی توپیں بن رہی ہیں۔ مجھہ سے قلعے ڈھائے جاتے ہیں۔ مجھہ سے فوجوں اور لشکروں کو تباہ کیا جاتا ہے پہلے زمانہ میں توپیں ہاتھی کھینچتے تھے گھوڑے کھینچتے تھے بیل اور اونٹ کھینچتے تھے۔ اب موٹریں کھینچتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں میل دو میل تک میرا گولا جاتا تھا اب ساٹھ ستّر میل تک میرا گولہ جا سکتا ہی۔

خدا نے مجھکو قتل و خونریزی کے لئے نہیں بنایا تھا مگر انسان نے مجھہ سے لاکھوں توپیں ڈھال کر تمام دنیا کو خونم خون کر دیا۔ اور بے شمار بچے توپوں کے ہاتھوں یتیم ہو گئے اور بیشمار عورتیں بیوہ ہو گئیں اور بے شمار ماؤں کے لڑکوں کو میں نے ہلاک کر ڈالا اور بیشمار بہنوں کے بھائی میرے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔

جرمنی کے کرپ کارخانہ کو بڑی شہرت ہے۔ کیونکہ وہاں مجھ لوہے کی توپیں بہت زیادہ ڈھلتی ہیں۔ امریکہ اور فرانس اور انگلستان اور جرمنی اور اٹلی اور ترکی کی عزت دنیا میں محض اس وجہ سے ہے کہ یہ سب ملک بہت سی توپوں کے مالک ہیں۔ اور میں ہی وہ چیز ہوں جس پر ہندوستان میں انگریزوں نے سوائے اپنی قوم کے اور کسی ہندوستانی قوم کو قبضہ نہیں دیا۔ یعنی توپخانوں کے افسر اور توپوں کے چلانے والے سب گورے ہوتے ہیں کالے نہیں ہوتے۔

یورپ کی بڑی لڑائی میں جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ توپوں نے اور لوہے کے بنے ہوئے دوسرے ہتھیاروں نے ایک کرور آدمی مار ڈالے جب میں اس ہولناک خونریزی کا خیال کرتا ہوں تو شرم سے میرا سر جھک جاتا ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ اس خونریزی میں میرا کچھ قصور نہیں ہے۔ انسان اپنی خود غرضی اور خود پسندی کے لئے یہ خونریزیاں کرتا ہے اور کراتا ہے اور نام بدنام میرا ہوتا ہے۔

پرانے زمانہ کی توپیں بہت بڑی بڑی ہوتی تھیں اور اُن کی تعریف طول و عرض کی وجہ سے کیجاتی تھی۔ موجودہ زمانہ میں توپیں چھوٹی ہوتی ہیں مگر ہنر کے ذریعہ اُن کی مار بہت دور کی رکھی جاتی ہے۔ اور اُسی توپ کی تعریف ہوتی ہے۔ جس کا گولہ بہت دور جائے اور بہت زیادہ تعداد میں انسانوں کو ہلاک کر سکے۔

مجھ لوہے کی بیتی میں توپ سب سے بڑا ہتھیار رہی۔ اور سب سے زیادہ ہلاک کرنیوالا ہتھیار ہے۔ جس دن اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا کہ میں آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں اور فرشتوں نے آدم کی خونریزی کا معاملہ پیش کیا تھا۔ اُس دن اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ انسان مجھ ناچیز لوہے سے ایسی توپیں بنائیگا جن سے خدا کی آبادزمین میں چاروں طرف بربادیاں پھیل جائیں گی۔ توپ خونریزی کی مجرم نہیں ہے۔ مجرم انسان ہے جو اس کو بناتا ہے اور چلاتا ہے۔ توپ مجبور محض ہے۔ اور ایک ایسے وجود کے ہاتھ میں مجبور ہے۔ جس کو قدرت نے آدھا مجبور اور آدھا مختار بنایا ہے۔ توپ نہیں جانتی کہ اُس کا گولہ کہاں جائیگا۔ جس رُخ توپچی نشانہ تاک لیتا ہے اُسی رُخ توپ گولہ پھینک دیتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بہت زور سے آواز دیتی ہے کہ اے انسان بچ جا۔ ہوشیار ہو جا۔ تیرے ہم جنس انسان نے ہلاکت کا

ایک گولہ تجھپر پھینکا ہی مشکل یہ ہی کہ توپ آواز دیتی ہی مگر ہوا اس آواز کو دیر میں پہنچاتی ہے گولہ آواز سے پہلے پہنچ جاتا ہی۔ اگر ہوا انسان کی وفادار ہوتی تو وہ آواز کو پہلے پہنچادیتی اور انسان گولہ آنے سے پہلے ہوشیار ہو جایا کرتا۔

مجھ لوہے سے میری سرگذشت پوچھی جاتی ہی۔ اور میں سب سے پہلے وہ بیتی اور وہ سرگذشت بیان کر رہا ہوں جو ہلاکت اور تباہی سے تعلق رکھتی ہی۔ اس واسطے رہ رہ کر مجھکو ندامت ہوتی ہی۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ان چیزوں کو جلدی ختم کردوں تاکہ پھر وہ اچھی سرگذشت بیان کرسکوں جس سے میری جنس کی اس کائنات میں عزت ہو۔

بندوق مجھ لوہے کی بیٹی۔ مگر بہت ہی کھوٹی۔ اور حد سے زیادہ شریر۔ اس کا کام بھی قتل و ہلاکت ہی۔ اس کی دو آنکھیں بھی ہوتی ہیں اور ایک آنکھ بھی۔ اور آج کل کے زمانہ میں سب بندوقیں ایک ہی آنکھ کی ہوتی ہیں۔ انسان بندوق کو چلاتا ہے تو پہلے چھاتی سے لگاتا ہی۔ بندوق شرماکر اپنا منہ دوسری طرف کرلیتی ہے اور نہیں چاہتی کہ کوئی شخص یہ دیکھ سکے کہ وہ انسان کے سینے سے لگی ہوئی ہی اسواسطے وہ ہر سامنے والے کو اپنی گولی سے ہلاک کرڈالتی ہی۔

بندوق انسانوں ہی کو ہلاک نہیں کرتی۔ حیوان بھی اس کے نشانوں سے عاجز ہیں ہرنیوں کو مار ڈالتی ہی اور اُن کے بچے جنگل میں اکیلے رہ جاتے ہیں۔ خوبصورت پرند جو کائنات کی صحرائی زندگی کے واسطے زینت تھے رات دن بندوقوں کے ہاتھوں ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔

مور جو پرما قوم کا معبود تھا اور جس کو قدرت نے بہت ہی عمدہ اور خوشنما لباس پہنایا تھا بندوق کے ہاتھوں چند سکنڈ میں مر جاتا ہی۔ آزاد مرغابیاں جو انسانی سیاحوں سے بڑھ چڑھ کر سیاحت کرنے والی ہیں بندوق سے عاجز ہوگئی ہیں۔ جب جھیل پر جاتی ہیں جب تالاب پر اور جس وادی میں سیر کے لئے اُترتی ہیں۔ اسی جگہ بندوق پہنچ جاتی ہی۔ کیونکہ بندوق ہر آزادی کی دشمن ہی۔ اگرچہ انسان نے اس کے برعکس مشہور کیا ہی کہ آزاد وہی ہی جس کے ہاتھ میں بندوق موجود ہو۔ لیکن بندوق انسانوں اور حیوانوں کی آزادی اور امن اور راحت کی زندگی کو برباد کرنے والی ہی۔

انسان نہایت مکاری سے جمع ہوتے ہیں اور مشورے کرتے ہیں کہ دنیا کی خونریزی
کو بند کرنا چاہیئے اور اس کی صورت یہی ہے کہ ہر قوم ہتھیاروں کا خرچ کم کردے۔ مگر یہ سب
مشورہ کرنے والے اپنے گھر میں چپکے چپکے نئی نئی توپیں نئی نئی بندوقیں اور نئے نئے
ہتھیار بناتے رہتے ہیں اور اپنے مجرم ضمیر کو یہ کہکر تسلی دیتے ہیں کہ خونریزی اس وقت
بند ہوگی اور امن اسی حالت میں حاصل ہوگا کہ ہم مسلح ہوں اور ہمارے پاس جنگ کی
پوری قوت موجود ہو۔ مجھے تو اپنی جنس لوہے کی سرگذشت بیان کرنی ہے اور بندوق
چونکہ مجھ لوہے سے بنتی ہے اس واسطے ضمناً انسانوں کا ذکر بھی آگیا۔ ورنہ خلاصہ صرف اتنا
ہے کہ بندوق لوہے سے بنتی ہے اور اس کی تمام زندگی قتل و خونریزی میں گذرتی ہے۔

بیشک بندوق سے موذی درندے بھی ہلاک کئے جاتے ہیں۔ جنکا مارنا اچھا سمجھا
گیا ہے کیونکہ ایک درندہ کو قتل کرنا بہت سی انسانی اور حیوانی جانوں کو موت سے محفوظ
کردیتا ہے۔ لیکن ہلاکت اچھی ہو یا بری ہو۔ اچھی نیت سے ہو یا بری نیت سے ہو بہرحال
ہلاکت ہی ہے اور بندوق اپنے افعال ہلاکت پر کسی طرح فخر نہیں کرسکتی۔

پستول

بہت چھوٹا۔ مگر بہت ہی کھوٹا۔ انسان کی جیب میں رہتا ہے۔ اور جب نکلتا
ہے۔ تو چٹکی بجاتے ایک دم پانچ یا سات جانوں کو ہلاک کرڈالتا ہے۔
کیونکہ کسی پستول میں پانچ گولیاں ہوتی ہیں اور کسی میں سات۔

لوہے سے بنتا ہے اور تیر کی طرح چٹکی سے چلتا ہے۔ بندوق بھی اشارۂ انگشت کی
محتاج ہے اور تیر بھی اور پستول بھی۔ مقصد یہ کہ انسان کے ہاتھ ان سب ہتھیاروں کو چلاتے
ہیں اور اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں پڑتے ہیں اور دوسروں کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں حالانکہ
اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمادیا تھا کہ اے انسانو! اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو
لیکن انسان بڑا ہی سرکش ہے وہ سب ہتھیار ہاتھوں ہی سے چلاتا ہے۔

پستول اور بندوق اور توپ بھی۔ تلوار و برچھی و خنجر کی طرح کسی کے دوست نہیں ہیں
یہ سب قبضہ کے ساتھی ہیں۔ جس کا ان پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ اُسی کے یار و مددگار بنجاتے ہیں
اگر کوئی انسان ان ہتھیاروں سے عاجزی یا محبت یا اور کسی طرح اصرار کرکے کہے کہ تم
بس میرے بنجاؤ اور کسی دوسرے کے ہاتھ میں جاکر کام نہ کرو تو ان میں سے کوئی ہتھیار
بھی کہنا نہ مانیگا۔ نہ بہ زاری۔ نہ بہ زور۔ نہ بہ زر۔ یہانتک کہ جب کسی پستول کا مالک

اور تا بعض اُس کو یہ حکم دیتا ہو کہ تو خود مجھی کو ہلاک کر دے تو پستول اس سے بھی انکار نہیں کرتا۔ اور خود کشی کرنے والے کے سر یا سینے کو اپنی گولی سے ہلاک کر ڈالتا ہی۔

آج کل توپوں اور بندوقوں اور تلواروں وغیرہ آہنی ہتھیاروں سے بہت زیادہ لوہا پستولوں میں خرچ ہوتا ہی۔ کیونکہ ہر آزاد آدمی اپنی آزادی کی اور اپنے جسم کی حفاظت پستول سے کرنی چاہتا ہی۔ پس یہ پستول کے لوہے کی سرگذشت ہی۔ معلوم نہیں کب تک پستول اور بندوق اور توپ کا زمانہ ختم ہوگا اور کب وہ وقت آئے گا کہ یہ سب خونی ہتھیار معطل و بیکار رہوں۔ اور اُن کو عجائب خانوں میں ایک تاریخی چیز کی طرح رکھدیا جائے۔ اور دیکھنے والے جس طرح تیروں کو دیکھتے ہیں۔ خنجروں اور برچھیوں کو دیکھتے ہیں اسی طرح ان خونریز ہتھیاروں کو بھی نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا کریں کہ یہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے سینکڑوں برس انسانوں کو خونریزی اور بے امنی میں مبتلا رکھا۔

مجھ لوہے کو ضروری معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنی سرگذشت کے سلسلہ میں گولوں اور گولیوں کا ذکر بھی کرتا۔ کیونکہ اصلی ہلاک کرنے والے گولے ہیں اور گولیاں۔ مگر آج کل سب گولے اور گولیاں محض لوہے ہی سے تیار نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن میں اور دھاتیں بھی استعمال کی جاتی ہیں اس واسطے میں نے ان دونوں کی سرگذشت اور چھوٹے ننھے چھرّوں کی سرگذشت بیان کرنی ضروری نہیں سمجھی۔ گولیاں اور چھرّے زیادہ تر سیسہ سے بنائے جاتے ہیں۔ سیسہ لوہے کی جنس سے علیٰحدہ چیز ہی۔ اگرچہ لوہے کے مشابہ ہی۔ لیکن اس کی نسل لوہے سے اتنی ہی دور ہی جتنی ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کے عقائد میں دوری ہی۔

قلم

الحمدللہ مہلک ہتھیاروں کی بیتی و سرگذشت ختم ہوئی۔ اور لوہے کے قلم کا زمانہ آیا وہ قلم جن میں توپوں اور بندوقوں اور پستولوں سے بہت زیادہ لوہا خرچ ہوتا ہے اور حساب لگایا گیا ہی کہ لوہے کی چھوٹی چھوٹی پتیاں اتنی کثیر مقدار میں تیار ہوتی ہیں کہ اگر تمام دنیا کی توپیں اور بندوقیں اور آہنی ہتھیار ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائیں

اور دوسرے پلڑے میں یہ پتیاں رکھی جائیں تو پتیوں کا پلڑا جھک جائیگا۔ کیونکہ اُن کا وزن بہت زیادہ ہوگا۔

پہلے زمانہ میں بانس کے اور نیزے کے قلم بنائے جاتے تھے۔ مگر اب تمام دنیا میں لوہے کے قلم کا رواج ہوگیا ہے اور جہاں کہیں نیزے کے قلم مروج ہیں۔ وہاں بھی یہ رواج آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔

آج کل مذہبی اور سیاسی، ہر قسم کی کتابیں اور اخبار لوہے کے قلم سے لکھے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لوہے کی قلم کی تحریر اچھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی۔ نیک کاموں کے لئے بھی ہوتی ہے اور بد کاموں کے لئے اور یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ قلم مہلک ہتھیاروں سے اچھا ہے۔ اور اس میں کوئی عیب نہیں ہے کیونکہ قلم بھی ایسے حروف اور ایسی عبارتیں لکھتا ہے جو عالم اخلاق میں شدید گناہ ہیں تاہم قلم کی نیکیاں گناہوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ اس واسطے مجھ لوہے کو قلم کے وجود پر فخر ہے اور میں اگر قلم کی سرگذشت تفصیل کے ساتھ لکھنی چاہوں تو دفتر کے دفتر ہو جائیں اور پھر بھی قلم کی حقیقت ختم نہ ہو۔

قلم مذہبی عبارتوں کو لکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ عبارتیں چھاپہ خانوں میں چھپتی ہیں۔ قلم عدالتوں میں فیصلے لکھتا ہے اور ظالموں سے مظلوموں کا حق دلواتا ہے۔ قلم دل کا اور دماغ کا ترجمان بنتا ہے اور انسان کے خیالات و جذبات کو کاغذ پر شکل حروف نمایاں کرتا ہے۔ قلم ہی وہ چیز ہے جس سے محبت اور نفرت شادمانی اور رنج والم کی کیفیات ظاہر کی جاتی ہیں۔

ایک عورت اپنے گھر میں بیٹھی ہے۔ اور اس کے سامنے برسات کے موسم میں نہایت مزیدار میٹھی ٹکیاں رکھی ہیں۔ اُس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر میرا شوہر بھی اس وقت یہاں موجود ہوتا تو وہ بھی یہ مزیدار ٹکیاں کھاتا اور اُن کی تعریف کرتا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے لوہے کا قلم ہاتھ میں لیا۔ روشنائی میں ڈبویا اور کاغذ پر اپنے شوہر کو یہ خط لکھدیا۔

یہ میٹھی ٹکیاں جو اماں جان نے بڑے چاؤ سے پکائی ہیں۔ کھا تو رہی ہوں۔ مگر رہ رہ کے تم یاد آرہے ہو۔

یہ خط جب شوہر کے پاس پہنچا۔ تو پہلے تو اس کے سامنے یہ تصویر آگئی کہ اس کی بیوی بیٹھی ہی اور اس کے سامنے دستر خوان بچھا ہوا ہی اور دستر خوان پر میٹھی ٹکیاں رکھی ہوئی ہیں جنکو وہ ہاتھ میں اُٹھاتی ہی۔ دانتوں سے توڑتی ہی اور دستر خوان پر نگاہیں جماکر کچھہ دل ہی دل میں سوچ رہی ہی۔ اس کے بعد شوہر کو خیال آتا ہے کہ وہ میٹھی ٹکیاں کھانے میں مجھے یاد کر رہی ہی اور اس کو مجھہ سے بہت زیادہ محبت ہی۔ پھر وہ تصور میں دیکھتا ہی کہ اس کی بیوی نے ٹکیاں کہاتے کہاتے ہاتھ سے رکھدیں اور اس نے قلم دوات لیکر مجھے خط لکھنا شروع کردیا۔

تو اگر لوہے کا قلم نہ ہوتا۔ یا لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہوتا۔ تو دل کی کیفیت مجسم ہو کر آنکھوں کے سامنے نہ آسکتی۔ یہ قلم ہی کی قوت تھی کہ اُس نے عورت کے دل کے چھپے ہوئے اور نظر نہ آنے والے ارمان کاغذ پر لکھدئے۔ اور وہ شوہر کے سامنے منہ سے بولتے ہوئے آگئے۔

قلم وہ حروف پیدا کرتا ہی جو دیکھنے میں خاموش ہیں۔ لیکن ہر وقت بولتے رہتے ہیں۔ مگر قلم کے حروف کا یہ قاعدہ ہی کہ اپنی بول چال کانوں کو نہیں سناتے بلکہ آنکھوں کو سناتے ہیں یعنی اگر کوئی شخص آنکھیں بند کر کے محض کانوں سے قلم کے لکھے ہوئے حروف کو پڑھنا چاہے تو نہیں پڑھ سکتا۔

لوہے کا قلم جب گھس جاتا ہی اور اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہی تو انسان اس کو پھینکدیتا ہی۔ اور اس بات کو بھولجاتا ہی کہ قلم نے اس کے ساتھ کتنی رفاقت کی تھی اور کتنے دن اس کے کام آیا تھا۔ مگر یہ تو انسان کی عادت ہی۔ وہ بڑا احسان فراموش ہے جس درخت کے پھل کہاتا ہی۔ اُسی کو کلہاڑی سے کاٹ ڈالتا ہی اور جن جانوروں کا دودھ پیتا ہی انہی جانوروں کے گلے پر چھری چلاتا ہی۔ اور جس زمین پر آرام کرتا ہی۔ اور جس زمین کے اندر مرنے کے بعد جاتا ہی اسی زمین کو پیشاب پخانہ کی گندگی سے خراب کرتا ہی۔

اگرچہ قلم کی سرگذشت بہت بڑی ہی اور قلم کے اس کائنات میں بڑے بڑے کارنامے ہیں لیکن انصاف یہ ہی کہ قلم محض ایک آلہ ہی۔ ورنہ اصل چیز انسان ہے توپ۔ بندوق۔ پستول۔ تلوار۔ خنجر اور تیر کی ہلاکت آفرینی میں بھی لوہا بے قصور ہی اور انسان خطاکار ہی کہ وہی ان ہتھیاروں کے لوہے سے قتل و خونریزی کرتا ہے

اور قلم بھی انسان ہی کے ہاتھ میں ہی۔ جیسا حکم انسان اپنے ہاتھ کو دیتا ہو اور جس رُخ ہاتھ قلم کو چلانا چاہتا ہو ویسی ہی تعمیل قلم کر دیتا ہی۔

قلم کی بیتی اور قلم کی سرگذشت ہزارہا سال سے ہی۔ لیکن لوہے کے قلم کی سرگذشت چند سالہ زندگی رکھتی ہی اور معلوم نہیں کہ اس کی عمر کتنی ہو۔ کیونکہ اب قلم کی جگہ بھی دوسری چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ مثلاً ٹائپ رائٹر وغیرہ جو انسان کو قلم سے لکھنے کی محنت نہیں کرنے دیتے اور انگلیوں کے اشارے سے ٹائپ کی مشین بڑی بڑی عبارتیں چھاپ دیتی ہی۔ لیکن یہ ٹائپ بھی لوہے کا ہوتا ہی۔ بعض لوگ پہلے قلم سے عبارت لکھتے ہیں۔ پھر اس کو ٹائپ میں چھاپتے ہیں اور بعض لوگ قلم سے لکھے بغیر ٹائپ کے ذریعہ لکھتے ہیں۔ بہرحال ٹائپ بھی ایک طرح کا قلم ہی۔ فرق صرف صورت کا ہی۔ کام کے لحاظ سے ٹائپ و قلم ایک ہی چیز ہی۔

چھاپنے کی مشینیں

مجھ لوہے سے صرف لکھنے کے قلم ہی نہیں بنائے جاتے۔ بلکہ چھاپنے کی مشینیں بھی لوہے سے بنتی ہیں جو دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں پھیل گئی ہیں اور جن کی وجہ سے کروڑوں کی تعداد میں کتابیں اور اخبار روزانہ چھپ چھپ کر انسانوں کی معلومات کو بڑھا رہے ہیں۔

اگرچہ جس چیز پر کاغذ چھپتا ہی وہ چیز لوہے کی نہیں ہوتی یا مسالہ کا پتھر ہوتا ہی اور یا سیسہ کے حروف ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ پتھر اور سیسہ کے حروف لوہے کی مشین کے بغیر کوئی چیز بطور خود چھاپ نہیں سکتے۔ اور ان کا چھاپنا لوہے کی امداد کا محتاج ہی۔ اس واسطے ماننا پڑتا ہی کہ چھاپہ کی مشینیں لوہے کی امداد سے چل رہی ہیں اور اس کائنات میں علم و معلومات کا چرچہ محض لوہے کے دم سے ہے۔

آٹا پیسنے کی چکیاں

پہلے زمانہ میں انسان پتھر کی چکی میں غلہ پیس کر کھاتا تھا اور چکی کو اپنے ہاتھ سے چلاتا تھا۔ یا پانی سے یا ہوا سے یا جانوروں سے کھچواتا تھا۔ مگر اب آٹا پیسنے کی

چکیاں بھی لوہے سے بنتی ہیں۔ پیانی تو پتھر ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن اس پتھر کو لوہے کی مشین چلاتی ہے۔ اور لوہے کی مشین کو بجلی یا بھاپ چلاتی ہے۔ گویا ہر انسان اپنی غذا مجھہ لوہے کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور میں آدمی کو چکی میں آٹا پیسکر نہ دوں تو وہ بھوکا مر جائے۔

کپڑے کی مشینیں

غذا اور خوراک کے بعد انسان کے لئے ایک ضروری چیز کپڑا ہے۔ جس سے انسان کی برہنگی دور ہوتی ہے اور جس سے انسان سردی اور گرمی میں اپنے جسم کی حفاظت کرتا ہے اور جو انسان کی عزت و شان کا باعث بنتا ہے۔

پہلے زمانہ میں ہاتھوں سے اور لکڑی کی مشینوں سے کپڑا بُنا جاتا تھا۔ اب کپڑا بننے کی مشینیں بھی لوہے سے تیار ہوتی ہیں اور دنیا میں لاکھوں کروڑوں گز کپڑا روزانہ یہ مشینیں بنا بنا کر تقسیم کرتی رہتی ہیں۔ امیروں کے لئے بھی یہی آہنی مشینیں کپڑا بناتی ہیں اور غریبوں کے لئے بھی۔ بادشاہوں کی شاہانہ پوشاک کا کپڑا انہی مشینوں میں تیار ہوتا ہے۔ اور غریبوں کی تن پوشی کا کپڑا بھی یہی مشینیں بناتی ہیں۔ انہی آہنی مشینوں کا کپڑا دولہا دلہن کے استعمال میں آتا ہے اور ان ہی مشینوں کا کپڑا مرنے والوں کو کفن میں دیا جاتا ہے۔

مجھ لوہے کی سرگذشت غذا اور لباس کے مسائل میں معمولی سرگذشت نہیں ہے اور انسان اگر تصور کرے تو اس کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ کھانے اور پہننے میں آج کل سراسر لوہے کا محتاج ہے۔

ریل کی سڑک

مجھہ لوہے کی سرگذشت میں لوہے کی سڑک بھی ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ پہلے زمانہ میں پتھر کی سڑکیں بنتی تھیں۔ مگر آج کل لوہے کی سڑک بنائی جاتی ہے اور اس پر ریل کے پہیئے دوڑتے ہیں۔

اب ریل تمام دنیا میں پھیل گئی ہے۔ یہانتک کہ مکہ میں بھی ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے اور حضرت اکبر الٰہ آبادی نے لکھدیا تھا۔ کہ انکو ریل کا انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے۔

پہلے زمانہ میں جو مسافت ایک مہینے میں طے ہوتی تھی اب وہ مسافت ریل کے ذریعہ ایک دن میں طے ہو جاتی ہے اور یہ محض مجھ لوہے کا کرشمہ ہے۔ لوہے کی سڑک پر لوہے کا پہیا چلتا ہے۔ اور انسانوں کے بوجھ کو ہزاروں لاکھوں میل پہنچاتا رہتا ہے۔
ریل کی سڑک اور ریل کا پہیا اور ریل کا انجن سب کے سب مجھ لوہے سے بنائے جاتے ہیں۔ مگر انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ مجھ سے اتنی خدمت لینے کے بعد بھی کہتا ہے کہ ریل دجال کا گدھا ہے۔ دجال چونکہ بری چیز ہے۔ اور گدھا بھی ایک احمق جانور ہے اس واسطے مجھ لوہے کو بڑی شکایت ہے کہ مجھ سے بنی ہوئی ریل کو دجال کے گدھے کا خطاب دیا جاتا ہے۔
مجھ لوہے کی سڑک بڑی مسلسل ہوتی ہے۔ ہزاروں میل تک اس کا سلسلہ قائم نظر آتا ہے۔ اگر ایک انچ کا فرق ہو جائے اور لوہے کی سڑک میں ایک انچ کا تفرقہ پڑ جائے تو پھر ساری سڑک بیکار ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ ریل کی سڑک میں رخنہ اور تفرقہ نہیں ہوتا۔ اس واسطے عالم مجاز میں اس کو صراط مستقیم کہہ سکتے ہیں۔ تعریف انجن کی کیجاتی ہے کہ وہ ریل کے ذریعہ لاکھوں من بوجھ کو کھینچ کر لیجاتا ہے۔ لیکن اصل تعریف سڑک کی کرنی چاہیئے کہ اگر مسلسل سڑک نہ ہو تو انجن اتنا بوجھ کبھی بھی نہ کھینچ کر لیجا سکے۔
حضرت محی الدین ابن عربی رضی اللہ تعالیٰ عنہ صوفیہ کرام میں ایک بہت بڑے عالم اور بہت بڑے فلاسفر گذرے ہیں۔ جنہوں نے فلسفہ تصوف کو سب سے پہلے نہایت تشریح و تفصیل کے ساتھ بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں قلم بند فرمایا تھا۔
اُنہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ اذا دخل السین فی الشین ظہر قبر محی الدین جب س ش میں داخل ہوگا اس وقت محی الدین کی قبر ظاہر ہوگی اور اتفاق یہ پیش آیا کہ جس مقام پر حضرت محی الدین ابن عربی کا مزار بنا تھا وہاں ایسا انقلاب ہوا کہ مکانات گر گئے اور مزار ملبہ میں چھپ گیا اور سینکڑوں برس تک ایک ٹیلہ کے اندر پوشیدہ رہا اور کوئی جان نہ سکا کہ حضرت محی الدین ابن عربی کا مزار کہاں ہے۔ یہاں تک کہ ترکوں کے سلطان سلیم نے ملک شام پر حملہ کیا اور جب وہ شام کے پایہ تخت دمشق میں آیا اور سارا ملک شام اس کے قبضہ میں آگیا تو اس نے ایک باغ بنانے کے لئے ٹیلہ کھدوایا اور اس ٹیلہ کے اندر سے حضرۃ ابن عربیؓ کا مزار نکل آیا۔ جس پر لوح لگی ہوئی تھی۔ سلطان نے

مزار کو با قاعدہ بنوا دیا اور حضرت کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ جب س یعنی سلیم شاہ یعنی ملک شام میں داخل ہو گا تو محی الدین کی قبر ظاہر ہو جائے گی اور ایسے ہی حضرت ابن عربی نے ایک اور پیشین گوئی کی تھی کہ "اذا اجری سکۃ الحدید یظہر دین الجدید" جب لوہے کی سڑک جاری ہو گی اس وقت ایک نئے دین کا ظہور ہو گا۔

پس اس پیشین گوئی کا بھی ظہور ہو گیا اور آج کل ملک شام میں اور تمام دنیا میں لوہے کی سڑکیں جاری ہو گئی ہیں اور پیشین گوئی کے موافق ایک نئے دین کا ظہور بھی ہو گیا ہے۔

وہ نیا دین یہ سکھاتا ہے کہ ہر دین کا انکار کر دو اور اپنی عقل اور تدبیر پر بھروسہ کرو۔

میں بے جان لوہا ظاہر میں شعور اور جان نہیں رکھتا۔ لیکن حقیقت میں میرے اندر جان بھی ہے اور شعور بھی ہے۔ جس طرح ایک زمانہ میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ نباتات کے اندر جان اور شعور موجود ہے مگر کلکتہ کے ڈاکٹر بوس نے اس کو ثابت کر کے دکھا دیا کہ درختوں میں جان ہے۔ درختوں میں زندگی ہے۔ درخت روتے ہیں۔ درخت ہنستے ہیں۔ درخت سوتے ہیں۔ درخت جاگتے ہیں اور درخت ہر قسم کے لوازمات زندگی سے آراستہ ہیں۔ اسی طرح میں لوہا اگرچہ ابتک بے جان اور بے شعور سمجھا جاتا ہوں لیکن عنقریب میرے شعور اور میری جان کی بھی تحقیقات ہو جائے گی۔

میں اپنی جان اور اپنے شعور مخفی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ انسان گمراہ ہو گیا ہے اور اس نے حضرت ابن عربیؒ کی پیشین گوئی کے موافق ایک نئے دین کو ظاہر کر دیا ہے۔ عقل اور تدبیر ضروری چیزیں ہیں۔ لیکن خدا ان سب سے زیادہ ضروری ہے نئے دین والے ظاہری مشاہدات پر اعتماد کرتے ہیں اور جو چیز مشاہدہ جسمانی سے اونچی ہو اس کو خلاف عقل کہکر رد کر دیتے ہیں۔ مگر اتنا نہیں سوچتے کہ اس کائنات کی بہت سی چیزیں ہیں جو انسان کے عقلی مشاہدہ کے موجب موجود ہیں۔ لیکن جسمانی مشاہدہ میں نہیں آ سکتیں۔ انسان جانتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز پانی اور ہوا سے زندہ ہے اور اب اس نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ پانی خود کوئی عنصر نہیں ہے بلکہ وہ مختلف ہواؤں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی جسمانی آنکھ پانی کو دیکھ سکتی ہے اور ہوا کو نہیں دیکھ سکتی۔ ہوا انسان کے جسم کو محسوس ہوتی ہے

لیکن آنکھ کے نور کو محسوس نہیں ہوتی۔ ہوا جب آندھی بنکر آتی ہے تو بڑی بڑی طاقت دار چیزوں کو مغلوب کر لیتی ہے۔ لیکن آجتک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا کہ ہوا گوری ہے یا کالی۔ لال ہے یا زرد۔ اُجلی ہے یا میلی اور نہ اب تک کوئی ایسا آلہ ایجاد ہوا جس کے ذریعے سے ہوا کی شکل نظر آسکے۔

بجلی جس کے بھروسہ پر موجودہ منکر انسانوں کے سب کام چل رہے ہیں اور جس پر قابو پانے کے سبب انسان نے نئے ملحدانہ دین کا دعویٰ کیا ہے وہ انسان بجلی کی حقیقت سے واقف نہیں ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ بجلی کیا چیز ہے وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ جب دو چیزیں آپس میں رگڑ کھاتی ہیں تو ایک حرارت پیدا ہوتی ہے اور اُسی حرارت کا نام برق ہے اور بجلی ہے مگر یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ بجلی کی ماہیت کیا ہے اور اس میں اور دنیا کی دوسری حرارتوں میں کس بات کا فرق ہے۔ اور یہ حرارت کہاں سے آتی ہے اور کیوں آتی ہے اور کس نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ جب دو چیزیں رگڑ کھائیں تو بجلی پیدا ہو۔

انسان پہاڑوں اور کانوں میں تلاش کر کے مجھ لوہے کو نکالتا ہے آگ میں پگھلاتا ہے میرا میل دور کر کے مجھ سے طرح طرح کی چیزیں بناتا ہے اور پھر اس پر بھی غور کرتا ہے کہ میں لوہا کیا ہوں اور میری پیدائش کیونکر ہوئی اور مجھ میں اور پہاڑ کے پتھروں میں اور خاک کے ذروں میں باہمی کس قسم کی مناسبت ہے اور کس قوت نے لال پتھر کو لال بنایا۔ سفید پتھر کو سفید بنایا اور کالے پتھر کو کالا بنایا اور کس طاقت نے مجھ لوہے کو یہ خاصیت دی کہ مٹی اور پتھر سے نکلتا ہوں اور پھر ہتوڑہ اور کدال کی صورت اختیار کر کے پہاڑوں کو توڑتا ہوں اور مٹی کا سینہ چاک کرتا ہوں۔

نئے دین کا منکر انسان کہتا ہے کہ یہ کائنات خود بخود ہو گئی پہلے پانی تھا اور پانی میں عرصہ دراز کے بعد مادہ نے جمتے جمتے پہاڑوں اور زمین کی صورت اختیار کر لی اور اس سے نباتات پیدا ہوئے اور پھر حیوانات پیدا ہوئے اور پھر انسان پیدا ہوا۔ مگر میں انسان سے پوچھونگا کہ اگر یہ سب کچھ خود بخود ہوا تو کیوں ہوا اور اس کائنات کا مادہ خود بخود کہاں سے آگیا۔ اور اس مادہ کی صورت ارتقاء نے یہ خاصیت کیوں اختیار کر لی کہ ہر چیز ایک خاص قاعدہ اور خاص اصول پر

بن گئی۔ گرمی میں حرارت سردی میں خنکی برسات میں بارش کے مقررہ پروگرام کس نے بنائے۔ اور حیوان اور انسان اور نباتات میں زندگی کی یکساں مشنری کس نے قائم کی اگر یہ سب کچھ خود بخود ہوتا تو جس طرح اتفاقی معاملات میں تغیر و تفاوت ہوا کرتا ہے ان چیزوں میں بھی تغیر و تفاوت ہوتا کہ کبھی صبح کے وقت سورج چھپ جاتا اور کبھی شام کے وقت سورج نکل آتا اور کبھی انسان امرود کا درخت بن جاتا اور کبھی جامن کا درخت مصطفےٰ کمال پاشا کی صورت اختیار کر لیتا۔

مگر جب سے یہ کائنات قائم ہوئی ہے۔ ایک دفعہ بھی مقررہ پروگرام میں کوئی اصولی تفاوت نہیں ہوا اور سب کے سب ایک قاعدہ اور حکم کے ماتحت چل رہی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑی قوت ان سب مادی قوتوں پر حکومت کر رہی ہے اور اسی کا نام خدا ہے۔

مجھ لوہے کی سڑک جاری ہو گئی اور نیا دین بھی ظاہر ہو گیا اور دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا کہ کائنات بیتی میں آہن بیتی، لوہا بیتی ایک خاص ممتاز حیثیت رکھتی ہے اگر میں لوہا دنیا میں نہ ہوتا تو موجودہ منکر دین انسان کے لاکھوں کام رک جاتے۔ صرف لوہے کی سڑک اور انجن کے طفیل جو مجھ لوہے سے بنتا ہے دنیا کے بے شمار کام چل رہے ہیں۔ پہلے زمانہ میں دہلی سے بمبئی جانا ہوتا تو بیلوں کی ایک گاڑی ڈیڑھ سو روپے کرایہ میں کیجاتی تھی اور ڈیڑھ مہینے میں دہلی سے بمبئی پہنچ سکتے تھے اور بمبئی تک ایسی ایسی تکلیفیں اور مصیبتیں رستہ کی اٹھانی پڑتی تھیں کہ سفر کو بصورت سقر ماننا پڑتا تھا۔ جگہ جگہ چوروں اور ڈاکوؤں کا ڈر۔ رستہ کے ہچکولے۔ میلی اور گندی سراؤں کا قیام۔ سڑے بسے کھانے۔ راتوں کا جاگنا۔ دن کی دھوپ اور بارش اور سردیاں بے شمار مصیبتیں تھیں جو انسان کو برداشت کرنی پڑتی مگر اب مجھ لوہے کے طفیل انسان دہلی میں بمبئی جانے کا ارادہ کرتا ہے اور اسٹیشن پر جا کر چاندی کے چند سکے دیکر بمبئی کا ٹکٹ خرید لیتا ہے اور ریل میں بچھونا بچھا کر لیٹ جاتا ہے اور ریل لوہے کی سڑک پر دوڑنا شروع کرتی ہے اور ایک رات دن میں بمبئی پہنچا دیتی ہے۔ جس کمرہ میں انسان ایک رات دن رہتا ہے وہ بعض ہندوستانی گھروں سے کئی حصہ زیادہ تکلف صاف ستھرا اور شاندار ہوتا ہے۔ نہ بہلی سی بیل

گاڑی کی تکلیف نہ گاڑی بان کا بیلوں کو مارنا اور گالیاں دینا نہ گاڑی کے ایسے ہچکولے کہ صبح سے شام تک انسان جامنوں کی طرح گھل جائے۔ نہ وہ سرائیں نہ وہ پڑاؤ۔ نہ وہ ڈیڑھ مہینہ۔ نہ وہ چور۔ نہ وہ ڈاکو۔ نہ مینہہ کا خوف نہ سردی کا ڈر نہ گرمی کا اندیشہ۔ یہ سب کچھ مجھ لوہے کے طفیل انسان کو حاصل ہوا ہے۔ مگر وہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی عقل و تدبیر سے یہ چیزیں بنائی ہیں۔ خدا کی قدرت کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔ اور اگر کوئی دخل تھا تو اب میں نے اُس دخل کو علیحدہ کر دیا ہے کیونکہ خدا بہت پرانا ہو گیا اور اس کے سب کام بھی بہت پرانے ہو گئے۔ خدا کو ترقی کرنے کا کچھ بھی شوق نہیں ہے۔ میں نے مٹی کا چراغ بنایا اس سے بڑھا تو ٹین کی ڈبیہ بنائی۔ اس سے بڑھا تو لیمپ ایجاد کیا۔ مومی اور کافوری شمعیں ایجاد کیں اور بڑھا تو گیس اور بجلی کی روشنی ایجاد کی طرح طرح کے خوشنما جھاڑ اور فانوس اور برقی قمقمے بنا ڈالے۔ مگر خدا کی قدامت پسندی کو دیکھو کہ پہلے دن چاند سورج کے جو دو چراغ بنائے تھے اس کے بعد کوئی ترقی نہیں کی اور کسی قسم کی نئی روشنی کا اضافہ اُنکے ہاں نہیں ہوا۔

انسان نہ بھول۔ تو نے مجھ لوہے سے جو کام لیا اور مجھ سے کام لینے کی جو عقل تجھ میں آئی اور جس علم اور جس فن اور جس تدبیر کے ذریعہ تو نے مجھکو مسخرہ کیا وہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ روشنی کی ترقیاں بھی جس قدر تو نے کیں وہ بھی سب یزدانی کرشمہ ہے۔ خدا روز سورج کو غائب کر دیتا ہے اور چاند کو گھٹاتا بڑھاتا رہتا ہے اور دنیا کی سب روشنیاں اسی چاند سورج کی حلقہ بگوش ہیں اور دنیا کے سب رنگ اسی سورج سے پیدا ہوتے ہیں اور کائنات کی حیات عجیب میں یہ سب کارستانیاں سورج کے ذریعہ سے خدا کر رہا ہے۔ تو سورج اور چاند کو پرانی روشنی کہتا ہے۔ او مٹی کے پتلے ہوش میں آ۔ یہی پرانی دو روشنیاں تیری نئی روشنیوں کو جگمگا رہی ہیں اور تو ایک سکنڈ بھی خدا کی قدرت اور قوت اور طاقت اور مشیت کے قبضہ سے آزاد نہیں ہے۔

ریل عرف ہندوستان میں وہ گاڑی ہے جو لوہے کی سڑک پر چلتی ہے اور اہل یورپ ریل اس سڑک کو کہتے ہیں۔ جس پر گاڑیاں چلتی ہیں۔ قرآن شریف

کی سورۂ نحل میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ اے انسان میں نے تیرے لئے گھوڑے پیدا کئے۔ ہاتھی پیدا کئے اونٹ پیدا کئے بیل اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تو انکی سواریاں لے اور تاکہ یہ جانور تیرے اسباب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجائیں اور جب تو ان سواریوں کو اپنے مکان پر باندھے تو یہ سواریاں تیرے گھر کی زینت اور عزت کا باعث ہوں۔

اب میں لوہا اللہ تعالیٰ کی ناچیز مخلوق انسان سے کہتا ہوں کہ اے آدمی میں تیرے لئے سڑک بنا اور میں تیرے لئے انجن بنا اور میں تیرے لئے گاڑیاں بنا تاکہ تو میرے فسٹ اور سیکنڈ اور انٹر اور تھرڈ میں سوار ہو اور تیری عورتیں اور تیرے بچے بھی اور تیرے دوست اور تیرے دشمن بھی اور تیرے تندرست اور تیرے بیمار بھی اور تیرے خوبصورت اور تیرے بدصورت بھی اور تیرے بڑے اور تیرے چھوٹے بھی اور تیرے کالے اور تیرے گورے بھی اور تیرے امیر اور تیرے غریب بھی اور تیرے اعلیٰ اور تیرے ادنیٰ بھی اور تو ایک منزل سے دو اور تین اور پانچ اور پچاس اور سو اور ہزار تک سفر کر سکے اور تیرا اسباب بھاری ہو یا ہلکا نازک ہو یا مضبوط بڑا ہو یا چھوٹا قیمتی ہو یا کم قیمت تجارتی ہو یا غیر تجارتی سب ایک جگہ سے دوسرے مقامات پر منتقل ہوتا رہے۔ اور تیری وہ سواریاں بھی جن کی نسبت قرآن مجید میں تفصیل بیان کی گئی تھی کہ خدا نے تیرے لئے ہاتھی گھوڑے۔ اونٹ۔ بیل۔ خچر۔ گدھے پیدا کئے وہ بھی سب سوائے ہاتھی کے مجھپر سوار ہوں اور میں انکو جہاں تو کہے وہاں پہنچا دوں اور تجھکو معلوم ہو جائے کہ جب خدا نے سورۂ نحل کے اندر مذکورہ سواریوں کا ذکر کیا تھا تو آخر میں یہ بھی فرما دیا تھا کہ "یخلق مالا تعلمون" اور پیدا کرے گا خدا ان مذکورہ سواریوں کے علاوہ اور ایسی سواریاں جنکو تم ابھی نہیں جانتے ہو۔

تو بس اُن آنے والی سواریوں میں میں بھی ایک ایسی سواری ہوں جس کی تیرہ سو برس پہلے خدا نے خبر دیدی تھی اور موٹر بھی ہے اور ٹرام بھی ہے اور سائیکل بھی ہے اور وہ سب سواریاں بھی ہیں جو آجتک مذکورہ سواریوں کے سوا جاری نہیں ہوئیں اور آیندہ ایجاد ہونگی۔

اور اے انسان دیکھہ جس طرح اونٹ گھوڑے ہاتھی وغیرہ گھر پر رکھنے سے خدا کے فرمان کے بموجب تیری زینت اور عزت ہوتی تھی۔ اسی طرح سے مجھہ سے بنی ہوئی ریل بھی تیری زینت اور عزت کا باعث ہوتی ہی کہ جب تو ریل کے فرسٹ کلاس میں بیٹھتا ہے تو سب سے بڑی عزت والا کہلاتا ہی اور جب تو سکینڈ کلاس میں سوار ہوتا ہی۔ تب بھی دوسرے درجہ کا عزت دار کہلاتا ہی۔ اور جب تو انٹر کلاس میں سوار ہوتا ہی تب بھی میانی درجہ کی تیری عزت ہوتی ہی اور جب تو تھرڈ کلاس میں سوار ہوتا ہی جب بھی تیری عزت اُن انسانوں سے بڑھی رہتی ہی جو مفلسی کے سبب تھرڈ کلاس میں بھی سفر نہیں کر سکتے۔

سگنل

مجھے دیکھو میں بھی لوہے کا ہوں۔ میری ایک ہی آنکھ ہی۔ مگر اس میں دو رنگ ہیں۔ کبھی لال اور کبھی سبز۔ میرا ایک ہی ہاتھ ہی کبھی بلند اور کبھی پست۔ میں حکمران ہوں اور میں محکوم بھی ہوں۔ میں ریل کو لال آنکھ دکھا کر حکم دیتا ہوں تو وہ رُک جاتی ہی۔ اور میں ریل کو سبز آنکھ دکھا کر آنے کی اجازت دیتا ہوں تو وہ آجاتی ہی۔ اور میں جب اپنا ہاتھ اُٹھا لیتا ہوں تو ریل آتے آتے سہم کر کھڑی ہو جاتی ہی اور جب میں اپنا ہاتھ جھکا لیتا ہوں تو ریل اپنے ڈر اور خوف کو دور کر کے میرے پاس آجاتی ہی اور آگے گزر جاتی ہی۔

یہ میری حکمرانی تھی اور میری محکومیت یہ ہی کہ انسان اپنے حکم سے مجھکو کبھی لال کرتا ہے کبھی سبز اور کبھی میرا ہاتھ اُٹھاتا ہی اور کبھی جھکاتا ہی اور مجھے انسان کے حکم کی اطاعت کرنی پڑتی ہی اور اس اطاعت ہی سے ریل کا سب کاروبار چلتا ہی۔

اے انسان تو مجھ سگنل پر قیاس کر کہ میں ہر ریل کی آمد و رفت کا حکمران ہوں اور بغیر میرے اشارہ کے کسی ادنیٰ اعلیٰ ریل کی مجال نہیں ہی جو ایک قدم بھی حرکت کر سکے لیکن یہ میرے احکام سب کے سب انسان کی ماتحتی میں ہیں اور در حقیقت وہی مجھپر حکومت کرتا ہی اور اسی کے شاہانہ اقتدار کی اطاعت اور غلامی سے میں ریل کا حکمران نظر آتا ہوں اگر تو بھی اے آدمی پروردگار کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری میری طرح کرنے لگے تو تیری سلطنت بھی ایسی ہی کامیاب ہو جائے کہ جیسی مجھ سگنل کی حکمرانی کامیاب ہی اور یاد رکھہ کہ اس کائنات میں اطاعت کے بغیر کوئی اختیار پیدا

۲۹ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ

نہیں ہوتا ہر حکومت اطاعت سے حاصل ہوتی ہے اور ہر آزادی پابندی سے ملتی ہے
جو لوگ اطاعت سے برگشتہ ہونے کو آزادی سمجھتے ہیں وہ آزادی کی حقیقت نہیں جانتے
کہ آزادی ہی وہ نعمت ہے جسکا ہر انسان طلبگار ہے اور پابندی اور اطاعت ہی وہ
چیز ہے کہ جب اس کی حدود مکمل ہو جائیں تو اس کا نام آزادی ہو جاتا ہے۔

اگر میں سگنل اسٹیشن ماسٹر کے احکام کی اطاعت نہ کروں اور جب وہ مجھ سے کہے
کہ لال روشنی دکھا تو ستیہ گرہ کے طور پر اور عدم تعاون اور ترک موالات اور
نان کواپریشن کے لئے میں اُس کا حکم نہ مانوں اور لال کی جگہ سبز روشنی دکھا دوں یا اگر
سبز روشنی کا حکم ملے تو لال دکھا دوں۔ یا ہاتھ اُٹھانے اور سیدھا رکھنے کا حکم ملے تو ہاتھ
جھکا دوں یا ہاتھ جھکانے کا حکم دیا جائے تو ہاتھ اُٹھا دوں یا سیدھا کر دوں
تو ایک ہی دن میں سب ریلیں زیر و زبر ہو جائیں اور اسٹیشن ماسٹر یہ سمجھکر کہ سگنل
خراب ہو گیا ہے مجھکو میری جگہ سے اُٹھا کر پھینکدے۔

ریل کا گولہ

میں توپ کا گولہ یا بندوق کی گولی نہیں ہوں بلکہ ایک نو ایجاد پیس میکر امن ساز
خطروں سے بچانے والا گولہ ہوں۔

پہلے زمانہ میں جب ریل کسی اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھی تو ریل کے گارڈ کو لائن کلیر دیا
جاتا تھا کہ بڑھ جاؤ سڑک صاف ہے۔ مگر انسان کی غفلت اور بھول سے اکثر حادثے پیش
آتے تھے۔ کیونکہ انسان کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ غلطی اور بھول سے بنایا گیا ہے۔ اسواسطے
سوچتے سوچتے مجھ بیجان لوہے سے ایک گولہ بنایا گیا اور انسان نے ایک ایسی ترکیب
ایجاد کی کہ جب تک میں ایک پوشیدہ صندوق سے باہر نہ نکلوں اور گارڈ کے حوالے
نہ کیا جاؤں اس وقت تک کوئی ریل اسٹیشن سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور میرے
ایجاد ہونے سے ہر قسم کے خطرے دور ہو گئے۔ گویا میرا ایک ہم شکل گولہ جس کی
کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے ہمیشہ ہلاکت کے کام کرتا تھا اور میں ہمیشہ حفاظت کے
کام کرتا ہوں۔ وہ خون کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اور میں خونریزی سے بچانے کے لئے بنایا
گیا ہوں اس لئے لوہے کی بستی میں جب توپوں اور بندوقوں اور گولوں اور گولیوں

کا تذکرہ ہو رہا تھا اور لوہا ان چیزوں کے قتل عام کی کیفیت بیان کرتے وقت شرمسار بن رہا تھا تو اسی طرح آج لوہا میری بیتی کے بیان سے سرخرو نظر آتا ہے۔ اور فخریہ کہہ رہا ہے کہ میں اگر انسان و حیوان کو توپ و بندوق کے ذریعہ ہلاک کرتا تھا تو آج میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میں سینکڑوں اور ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کو ہلاکت سے بچانے کا کام بھی کر رہا ہوں اور ریل کے محکمہ میں جب سے میری ایجاد ہوئی ہے حادثات بہت ہی کم ہو گئے ہیں اور شاذ و نادر ہی کوئی واقعہ سننے میں آتا ہے۔

اگر تم سب لوگ ریل کی نئی نئی ایجادوں سے واقف ہوتے تو میں ہیں میکر آہنی گولہ اپنی حقیقت کو پوری تشریح کے ساتھ بیان کرتا۔ لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگا کہ میں کیا ہوں اور میری وجہ سے کیونکر ریلوں کی آمد و رفت کا انتظام درست ہوا ہے اور کیونکر خطرات سے انسان کو نجات ملی ہے۔

ٹکٹ چھاپنے کی مشین

میں بھی لوہے کی ہوں ہر اسٹیشن کے ٹکٹ گھر میں بالشت بھر اونچی ایک چھوٹی سی گڑیا کھڑی رہتی ہے۔ جب ٹکٹ خریدنے والے آتے ہیں تو بابو صاحب سادے ٹکٹ الماری میں سے نکالکر میرے منہ میں ڈالتے ہیں اور میں اس ٹکٹ پر تاریخ اور سن چھاپ دیتی ہوں اور بڑے اسٹیشنوں پر رات دن میں مجھکو ہزارہا ٹکٹ چھاپنے پڑتے ہیں۔ اگر میں تاریخ چھاپکر نہ دوں تو کوئی شخص سفر نہ کر سکے۔ اور اگر میں نہ ہوتی اور آدمی کو اپنے قلم سے تاریخ لکھنی پڑتی تو سینکڑوں آدمی ٹھیک وقت پر ریل میں سفر نہ کر سکتے اور یا ریلوے کے محکمہ کو تاریخیں لکھنے کے لئے ایک بڑا عملہ رکھنا پڑتا۔

لوہے کی بیتی میں نئے زمانہ کی ایسی بے شمار چیزیں نظر آئیں گی جو انسان کی زندگی کو فائدہ پہنچا رہی ہیں اور انسان ان چیزوں کا محتاج بنا ہوا ہے۔ انہیں چیزوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ اگرچہ میرا بیان چھاپہ خانہ کے سلسلہ میں ہونیوالا تھا۔ لیکن میرا تعلق ریل کی برادری سے ہے۔ اس واسطے میں اپنی ہی پنچایت میں بیٹھکر اپنی بیتی سنانی چاہتی ہوں۔ اس لئے میں نے سنا دی۔

لوہے کی ترازو

ریل کی سبھا پتی صدر انجمن اور پریزیڈنٹ لوہے کے سامنے انصاف کے ہاتھ باندھکر عرض کرتی ہوں کہ آہن بیتی میں میرا ذکر بھی شریک کیا جائے۔ میں ریل کی برادری میں ہوں اور اس برادری سے آزاد بھی ہوں۔ میری زیادہ ضرورت آج کل ریل کے محکمہ میں ہی۔

پہلے زمانہ میں لکڑی کی ڈنڈی اور سوت کی ڈوریاں اور چمڑے یا لکڑی کے پلڑے بنائے جاتے تھے اور اس کا نام ترازو ہوتا تھا اور عرب والے اسکو میزان کہتے تھے مگر اب چونکہ ہر چیز لوہے کی بن گئی ہی اور نئے سائنس کے ذریعہ ہر چیز کلوں اور مشینوں کی صورت میں آگئی ہی۔ اس واسطے ترازو کی بھی ایک مشین بنی ہی جس میں سو پچاس من بوجھ ایک ہی وقت میں تل جاتا ہی اور بعض ترازو کی مشینیں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ ہزاروں من وزن ایک منٹ میں تول سکتی ہیں۔ اس نئی ترازو میں نہ ڈنڈی ہی نہ پلڑے ہیں بلکہ لوہے کی ایک چوکی ہی جس کے اندر مشین لگی ہوئی ہی اور مشین کے اوپر لوہے کی ایک سل بچھی رہتی ہی۔ پہلے مشین کے پرزوں کو ایک دستی سے اُٹھاتے ہیں اور وہ سل اُدہر ہو جاتی ہی اس کے بعد اس سل پر تولنے کے لئے بوجھ رکھدیا جاتا ہی۔ اور مشین کے نمبر بتا دیتے ہیں کہ اس چیز میں کتنا وزن ہی۔

اس مشین پر آدمی بھی تل جاتے ہیں اور ریل کا اسباب بھی۔ اگر ریل کا محصول انسانوں سے اُن کے وزن کے موافق لیا جاتا تو موٹے آدمیوں کا کرایہ دگنا لیا جاتا۔ لیکن ریل نے آدمیوں کا وزن مقرر نہیں کیا صرف اسباب تول کر لیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ ایک بہت موٹا آدمی ریل کی کھڑکی پر گیا اور اس نے بابو سے اُس جگہ کا ٹکٹ مانگا جہاں اس کو جانا تھا۔ بابو نے کہا ایک روپیہ کرایہ لگیگا۔ اس شخص نے دو روپے نکالکر بابو کے سامنے رکھے بابو نے دوسرا روپیہ دیکھکر حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ موٹا آدمی سمجھا کہ شاید میرا وزن اسکو اتنا زیادہ معلوم ہوتا ہی کہ دگنا کرایہ کافی نہیں سمجھتا۔ اس واسطے اس موٹے آدمی نے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا کہ جناب میرا بدن بادی سے پھول گیا ہی وزن بہت زیادہ

نہیں ہے۔ اگر آپ مجھکو تول کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ دُگنا محصول کم معلوم نہیں ہوگا بابو کو بے اختیار ہنسی آگئی اور اس نے ایک روپیہ واپس کرکے کہا کہ ہمارے ہاں زن پر ٹکٹ نہیں دیا جاتا۔ ہم آپ کو ایک ہی روپے میں بھیجدیں گے۔

میں ترازو ہوں۔ میں میزان عدل ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ میں ہمیشہ ہر چیز کا ٹھیک وزن بتاؤں اسواسطے لوہے کی جنس میں ہر جگہ میری عزت کی جاتی ہے اور مجھکو بہت نیک اور پارسا سمجھا جاتا ہے۔ یہانتک کہ جب شاہجہاں بادشاہ نے نئی دہلی بنائی اور لال قلعہ تیار کرایا تو دیوان خاص کے سامنے جالی پر جو ہر وقت بادشاہ کی نظر کے سامنے رہتی تھی سنگ مرمر میں ترازو کی تصویر بنوادی تاکہ بادشاہ کو دربار کے وقت عدل و انصاف یاد رہے۔ لیکن آج کل کے انسان ایسے ہیں کہ مجھ ترازو کے ذریعہ طرح طرح کی بے ایمانیاں کرتے ہیں اور ریل کے وہ ملازم جو مال گودام میں نوکر ہوتے ہیں ایسی ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں جن سے میرا انصاف قائم نہیں رہ سکتا اور کبھی میں سیر کو ڈیڑھ سیر دکھاتی ہوں اور کبھی ڈیڑھ سیر کو تین پاؤ۔ مگر میرا اس میں کچھ قصور نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان چالاکی اور دغابازی سے ایسی حکمتیں کرتا ہے کہ میں غلط تولنے لگتی ہوں کبھی وہ مجھ سے لگ کر کھڑا ہوجاتا ہے اور کبھی میرے کسی پرزہ کو بگاڑ دیتا ہے اور کبھی پاؤں کے اشارے سے کچھ خرابی پیدا کردیتا ہے۔ میرا اس میں کچھ قصور نہیں ہے۔ میں ہر وقت عدل وانصاف کے خیال میں رہتی ہوں اور جب انسان مجھسے دغابازی کراتا ہے تو مجھے بڑا ہی غصہ آتا ہے اور میں اس پر اپنی زبان میں پکار پکار کر لعنت بھیجتی ہوں۔ لیکن چونکہ ابھی تک انسان نے مجھ لوہے کی آواز سننے کی مشق حاصل نہیں کی ہے۔ اس واسطے وہ میری آواز کو سُن نہیں سکتا۔

قرآن مجید میں کم تولنے اور کم ناپنے کی بہت جگہ برائی آئی ہے اور یہ لکھا ہے کہ بہت سی قومیں محض اس وجہ سے تباہ ہوگئیں اور ان پر آسمانی عذاب نازل ہوا کہ وہ کم تولتی تھیں اور کم ناپتی تھیں اور جب گنہگار لوگ خود لیتے تھے تو بڑھتی تولتے تھے اور بڑھتی ناپتے تھے اور جب دوسروں کو دیتے تھے تو کم تولتے تھے اور کم ناپتے تھے۔ گویا ہر کام میں اپنے فائدہ اور دوسرے کے نقصان کے خواہاں رہتے

تھے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کو اس قدر ناگوار گذری کہ اُن قوموں پر آسمانی عذاب نازل ہوا اور وہ قومیں زیر و زبر ہو گئیں۔

خطرہ کی زنجیر

یا اھل الکائنات! سلامٌ علیکم میں لوہے کی زنجیر ہوں اور اُسی قسم کی زنجیر جو قیدیوں کے ہاتھوں اور پیروں اور گردن میں ڈالی جاتی ہے۔ اور جس سے کُتے بھی باندھے جاتے ہیں اور جو دنیا کے بے شمار اچھے بُرے کاموں میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔

آج ریل کی برادری مجلس داستان گوئی میں جمع ہے۔ ریلوے اشیاء کا ہر وہ حصہ جو لوہے سے بنا ہے اپنی بیتی اور اپنی سرگذشت سنا رہا ہے۔ اس لئے میں بھی آئی ہوں اور اپنا بیان سناتی ہوں۔ پہلے زمانہ میں جب ریل کی گاڑیوں کے اندر آگ لگجاتی تھی یا مسافروں کی کوئی بہت ضروری چیز گر پڑتی تھی یا کوئی مسافر یا اُن کا بچہ گر جاتا تھا یا اور کسی قسم کا خطرہ پیش آتا تھا تو ریل ٹھہرانے کے لئے کوئی ذریعہ اور طریقہ نہ تھا۔ مسافر چیختے تھے ریل کی کھڑکیوں سے ہاتھ باہر نکالکر انجن والوں کی طرف اشارے کرتے تھے یا لال کپڑے اڑاتے تھے یا لکڑیوں میں کپڑے باندہ کر ہلاتے تھے تب گاڑی ٹھہرتی تھی۔ لیکن اس پر بھی گاڑی کا ٹھہرنا یقینی نہ تھا۔ کیونکہ رات کے وقت انجن والوں کو یہ کپڑے اور ہاتھ دکھائی نہ دیتے تھے اور دن کے وقت ریل چلنے کے غل شور میں مسافروں کے چیخنے چلانے کی آواز نہ آتی تھی اور بیچارے مسافر طرح طرح کی مصیبتوں اور تباہیوں میں پھنس جاتے تھے۔ اسواسطے انسان نے سوچتے سوچتے اپنے اور مسافروں کے بچاؤ کے لئے ایک ترکیب نکالی کہ ہر گاڑی میں لوہے کی ایک زنجیر لگادی جسکا سلسلہ انجن تک ہوتا ہے اور جب کوئی مسافر خطرہ کی حالت میں اس زنجیر کو کھینچتا ہے تو انجن والوں کو خبر ہو جاتی ہے اور وہ فوراً انجن کو روک لیتے ہیں اور انکو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس گاڑی اور کس درجہ میں زنجیر کھینچی گئی ہے اور وہ سیدھے اُسی مقام پر آ جاتے ہیں اور مسافروں کو مدد دیتے ہیں۔

جس جگہ یہ زنجیر ہوتی ہے وہاں لوہے کے حرفوں میں یہ بھی لکھا رہتا ہے

کہ جو شخص بے ضرورت اس زنجیر کو کھینچیگا اس پر پچاس روپے جرمانہ ہوگا لیکن اب تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ضرورت کی کیا تعریف ہے۔ بعض مسافر چوروں کے حملہ کے وقت زنجیر کھینچتے ہیں اور بعض مسافر اپنی کسی قیمتی چیز کے گرجانے سے زنجیر کھینچ لیتے ہیں اور بعض مسافر کسی آدمی کے گر جانے کی وجہ سے زنجیر کھینچ لیتے ہیں اور بعض ایسے بھی بیوقوف ہوتے ہیں کہ اس زنجیر کو سہارے کی چیز سمجھکر اس کو پکڑتے ہیں اور کھڑے ہونے کا سہارا لینا چاہتے ہیں جس سے ریل ٹھہر جاتی ہے اور زنجیر کھینچنے والے پر پچاس روپے جرمانہ ہوجاتا ہے۔

اور ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض ہندوستانی گرجاتے ہیں اور دوسرے مسافر اُن کے لئے زنجیر کھینچتے ہیں تو ریل کے افسر خفا ہوتے ہوئے آتے ہیں کہ تم نے زنجیر کیوں کھینچی اُس آدمی کی یہی سزا تھی اس نے کھڑکی کو بند نہ کیا اور بے احتیاطی سے کھلی ہوئی کھڑکی پر ہاتھ رکھکر باہر جھانکنے لگا۔ اس لئے گر گیا دوسروں کی عبرت کے لئے ایسے آدمی کا گرنا اور چوٹ کھانا ہی اچھا تھا۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک گوری میم صاحبہ کا ایک پالتو نیولہ ڈاک گاڑی سے گر گیا اور میم صاحب نے خطرہ کی زنجیر کھینچ لی اور ڈاک گاڑی ٹھہر گئی۔ اور گارڈ صاحب لالٹین لیکر جنگل کی بڑی بڑی گھاس میں میم صاحب کے نیولہ کو آدھ گھنٹہ تک تلاش کرتے رہے اور ڈاک گاڑی ایک نیولہ کے لئے رُکی کھڑی رہی۔

بہرحال میرا نام خطرہ کی زنجیر ہے اور میں ریل کو اور اس کے مسافروں کو ہر قسم کے خطرہ سے بچانے کے لئے بنائی گئی ہوں اور لوہا میرے وجود پر فخر کرسکتا ہے کہ میں ایک بہت اچھے کام کے لئے استعمال ہوتی ہوں اور لوہے کی جتنی زیادہ انسانی خدمات ہیں اُن خدمات کی تعداد میں میرا بھی ایک نمبر ہے اور جب اُن تمام آہنی اشیاء کو سلسلہ وار سامنے رکھا جائے جو لوہے سے بنتی ہیں اور پھر اُنکے اچھے برُے کاموں پر بھی نظر ڈالی جائے تو میں یقین کرتی ہوں کہ لوہے کے اچھے کاموں کا اور مفید کاموں اور رفاہ عوام کے کاموں کا شمار برائیوں سے بہت زیادہ بڑھ جائیگا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرتی ہوں کہ مجھکو

ایک ایسے کام کے لئے منتخب کیا گیا جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور کسی انسان کی تکلیف اور ایذا رسانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

لفٹ

ریلوے جماعت کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ میں محض ریل کے لئے مخصوص نہیں ہوں مجھکو ہوٹلوں اور بڑے بڑے اونچے مکانات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ریلوے اسٹیشنوں پر بھی کہیں کہیں مجھکو لگا لیتے ہیں۔ لیکن چونکہ میرا زیادہ تعلق ہوٹلوں سے رہتا ہے اور ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے ریل کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتے ہیں اس واسطے اگر مجھکو ریلوے اشیا میں شریک کر دیا جائے تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

میں لوہے کا اُڑن کھٹولہ ہوں۔ میں لوہے کا چلتا پھرتا زینہ ہوں۔ جو مکانات چار پانچ چھ یا اس سے زیادہ منزلوں کے بنائے جاتے ہیں اُن پر زینہ کے ذریعہ چڑھنا انسان کو تھکا دیتا ہے اور وقت بھی زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اور اہل یورپ نے ہر ایجاد کے اندر وقت کی بچت کے اصول کو مقدم رکھا ہے۔ اس واسطے مجھکو ایجاد کیا گیا۔ میں ایک فراٹے میں مسافروں کو لیکر پہلی دوسری تیسری۔ چوتھی پانچویں اور ان سے زیادہ اور جتنی منزلیں ہیں اُنپر پہنچ جاتا ہوں اور ایسے ہی اوپر کی منزلوں سے نیچے بھی مسافروں کو آن کی آن میں لے آتا ہوں۔ میری شکل ہنڈولہ کی سی ہوتی ہے اور میرے اندر تین چار آدمی ایک وقت میں آسکتے ہیں۔ میں سراسر لوہے سے بنایا جاتا ہوں۔ اور بجلی کے ذریعہ یا اور مشینری کی طاقت سے مجھکو اوپر لیجاتے ہیں اور نیچے لاتے ہیں

ریل کے بڑے اسٹیشنوں پر جہاں بہت سے پلیٹ فارم ہوتے ہیں پلیٹ فارموں کے نیچے تہہ خانے بنائے جاتے ہیں اور ہر پلیٹ فارم پر ایک لفٹ لگایا جاتا ہے تاکہ مسافروں کا اسباب آسانی کے ساتھ لوہے کے ٹھیلوں میں بھر کر تہہ خانہ کے اندر لیجائیں اور پھر جس پلیٹ فارم پر اسباب لانا منظور ہو لفٹ کے ذریعہ وہ سامان اس پلیٹ فارم پر کھینچ لیں۔

جہاں یہ لفٹ نہیں ہوتے وہاں مزدور اسباب اُٹھا کر ریل کے پلوں پر چڑھتے ہیں اور بڑی دشواریوں کے ساتھ مسافروں کا سامان ایک پلیٹ فارم

سے دوسرے پلیٹ فارم تک جا سکتا ہے۔ اے ہستی نمود کے بزم نشیں سننے والو۔ یہ میری داستان ہے۔ اور یہ میری آپ بیتی ہے اور یہ میری سرگذشت ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ میں انسانوں کے اور پردیسی آدمیوں کے اور عورتوں کے اور بچوں کے اور بیماروں کے اور ہر قسم کے کمزور آدمیوں کے کسقدر کام آتا ہوں۔ جب تک مجھکو لوہے سے نہیں بنایا گیا تھا بیمار زینہ پر نہیں چڑھ سکتے تھے اور موٹے آدمی زینہ پر چڑھتے چڑھتے ہانپ جاتے تھے۔ اور نازک بدن حسین عورتیں زینہ کی چڑھائی کو دیکھکر پریشان ہو جاتی تھیں۔ مگر میں نے اس کائنات میں نمودار ہو کر سب کی تکلیفیں دور کر دیں اور میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ اچھے مجھ سے فائدہ اُٹھائیں اور بُرے میری امداد سے محروم رہیں۔ خوبصورت میری گود میں آئیں اور بدصورت دور کھڑے رہ جائیں۔ امیر مجھپر سوار ہوں اور غریب مجھ سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں میں تو ہر ایک کے لئے ہر وقت خدمت کے لئے آمادہ و مستعد رہتا ہوں۔

اس واسطے لوہا میرے وجود پر فخر کر سکتا ہے اور میں اس پر فخر کر سکتا ہوں کہ میں لوہے سے بنا اور مجھ سے مہلک ہتھیار نہیں بنائے گئے۔ بلکہ ایسی چیز بنائی گئی جو ہر وقت دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور ایذا رسانی کی کوئی بات اس میں نہیں ہے۔

سڑک کا دیدبان ٹھیلہ

جس طرح ہادی اور مرشد مریدوں کے اعمال و کردار کی نگرانی کرتا ہے اور جسطرح علماء دین عام مسلمانوں کی شرعی پابندی اور عدم پابندی کو دیکھتے رہتے ہیں اسی طرح ریل کی سڑک کی نگرانی کے لئے ایک لوہے کا ٹھیلہ بنایا جاتا ہے جس پر مقررہ ملازمین سوار ہو کر ایک مقررہ مسافت تک جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ سڑک میں کوئی خرابی تو نہیں ہوگئی ہے۔ جنگلی جانوروں یا برسات یا اور کسی وجہ سے لوہے کی پٹری یا لکڑی کے سلیپر یا اس مٹی میں جس پر سلیپر بچھا کر پٹری ڈالی جاتی کوئی نقص واقع ہو گیا ہو تو اس کو فوراً درست کرا دیا جاتا ہے۔ تاصکر دریاؤں اور ندیوں اور نالوں کے پلوں کی دیکھ بھال اسی آہنی ٹھیلہ کے ذریعہ کیجاتی ہے

اور آہنی ٹھیلہ والے اکثر تمام رستہ کے اور پلوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔
یہ ٹھیلے از سرتاپا لوہے کے ہوتے ہیں اور دو آدمی انکو پیچھے کی طرف سے
دھکیلتے ہیں اور جب ٹھیلہ تیز دوڑنے لگتا ہے تو یہ آدمی دوڑکر ٹھیلہ پر بیٹھ جاتے ہیں
قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعا سکھائی تھی کہ ہر نماز میں سورۂ
فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور سورۂ فاتحہ میں اس دعا کو شریک کر دیا گیا تھا جو یہ ہے
اھدنا الصراط المستقیم یا اللہ! ہمکو سیدھا رستہ دکھا۔
پس اگر لوہے سے بنا ہوا یہ ٹھیلہ دنیا کے مجازی رستوں اور سڑکوں کی نگرانی
کرتا ہے۔ اور ریل کو اور ریل کے مسافروں کو رستہ کے خطروں سے بچاتا ہے تو گویا
حکم الٰہی کی تعمیل بجا لاتا ہے۔ اسواسطے وہ لوہا جو ہٹیلہ کے پہیوں میں لگایا گیا اور
وہ لوہا جو ٹھیلہ کے دھروں میں لگایا گیا اور وہ لوہا جس سے ہٹیلہ کا بالائی ڈھانچ
تیار کیا گیا سب ہی کائنات کی موجودات میں اپنی زندگی کی سرگذشت کو فخریہ
لہجے میں بیان کر سکتے ہیں۔ اور اُن کا یہ دعویٰ کہ لوہا بعض اوقات اشرف المخلوقات
انسان سے بھی بڑھ جاتا ہے تعلّی اور مبالغہ معلوم نہیں ہوتا۔

ٹیلیفون

اگر کوئی شخص نئی روشنی کے انسانوں کے سامنے یہ کہتا کہ میرے پیر بمبئی میں بیٹھکر
کلکتہ کی بات سُن لیتے ہیں اور اپنی بات کلکتہ والوں کو سنا دیتے ہیں تو نئی روشنی
والے ایک قہقہہ لگا کر اس شخص کو احمق اور توہم پرست کا خطاب دیدیتے۔ لیکن
لوہے کا بنا ہوا اور انسان کے ہاتھوں سے بنایا ہوا انٹ بھر کا ایک آلہ جسکو ٹیلیفون
کہتے ہیں اس کے ذریعہ ایک منٹ کے اندر بمبئی والے کلکتہ سے اور کلکتہ والے
بمبئی سے اور دہلی والے پشاور سے اور پشاور والے دہلی سے گھر بیٹھے باتیں کر سکتے
ہیں۔ اور کوئی اس عجیب غریب ایجاد کو توہم پرستی اور احمق پن نہیں کہتا۔
حالانکہ یہ ایجاد ظاہری علم اور ظاہری ہنر کے ذریعہ ہوئی ہے اور اولیاء اللہ
باطنی علم کے ذریعہ گھر بیٹھے تمام دنیا سے باتیں کرتے ہیں اور تمام دنیا کی باتیں
سنتے ہیں اور اگرچہ باطنی علم کی فوقیت اور برتری کو ہر ایک نے تسلیم کیا ہے

پھر بھی آجکل اہل اللہ کے تصرفات باطنی کو خلاف عقل کہا جاتا ہے۔ اگر کسی گاؤں یا ایسی آبادی میں جاکر ٹیلیفون کا ذکر کیا جائے جہاں کے باشندوں نے نہ کبھی ٹیلیفون کو دیکھا ہو نہ اُس کا حال سُنا ہو تو اس گاؤں اور آبادی کے باشندے بھی ٹیلیفون کا حال بیان کرنے والے کو جھوٹا اور خلاف عقل باتیں کرنے والا کہیں گے۔ ابھی حال میں جب افغانستان میں ٹیلیفون جاری کیا گیا۔ تو بعض افغان علماء نے ٹیلیفون کے استعمال سے انکار کیا اور کہا کہ اس کے اندر شیطان بولتا ہے۔ ان علماء کو جواب دیا گیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ شیطان لاحول سے بھاگ جاتا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں سچ ہے۔ اسوقت ٹیلیفون والوں نے ایک مولوی صاحب کو ٹیلیفون کا ریسور دیا اور کہا لو سُنو اور اس کے بعد اس نے ٹیلیفون میں زور زور سے لاحول پڑھنی شروع کی اور جب مولوی صاحب نے لاحول کی آواز سن لی تب انکو یقین آیا کہ یہ شیطان کی آواز نہیں ہے بلکہ انسان کے دنیادی علم کا ایک ہنر ہے

اسی طرح اُن لوگوں پر قیاس کرنا چاہیئے جو باطنی علوم سے ناواقف ہیں۔ مگر باطنی علوم کے کمالات کو خلاف عقل کہتے ہیں۔

ہمزاد کا چرچا ہر جگہ سُنا ہو گا کہ وہ جب مسخر ہو جاتا ہے تو ہر جگہ کی خبریں دیا کرتا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ہمزاد ایک مخفی وجود ہے جو ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس آدمی کے ساتھ رات دن رہتا ہے جس کے ہمراہ اس کی پیدائش ہوئی ہو۔ اسی واسطے اس کا نام بھی ہمزاد رکھا گیا ہے۔ عامل لوگ اس ہمزاد کو مسخر اور تابعدار کرنے کے لئے عمل پڑھتے ہیں۔ اور تسخیر ہمزاد کے انہوں نے سات طریقے قائم کئے ہیں جنیں تین علوی ہیں اور تین سفلی ہیں اور ایک درمیانی ہے۔ ان سات طریقوں میں کسی ایک طریقہ کو منتخب کر کے ہمزاد کا عمل پڑھا جاتا ہے اور جب ہمزاد تابع ہو جاتا ہے تو وہ پوشیدہ خبریں دیا کرتا ہے۔ مثلاً جس شخص کے کوئی ہمزاد تابع ہو اور اس شخص سے کوئی اجنبی آدمی ملنے کے لئے آئے تو وہ ہمزاد سے کہتا ہے کہ اس آنے والے کا نام اور سکونت اور اس کے گھر کے حالات دریافت کر چنانچہ وہ مسخر ہمزاد آنے والوں کے ہمزاد سے تمام کیفیتیں دریافت کر کے اپنے عامل کو بتا دیتا ہے۔ لیکن اس گفتگو کو سوائے عامل اور اس کے ہمزاد کے اور کوئی آدمی نہیں سن سکتا اس لئے عامل ہمزاد اپنے پاس آنیوالے آدمیوں کا نام اور پوشیدہ حالات بیان کر دیتا ہے اور

آدمی حیران ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص کوئی ولی کامل ہے۔ جس کو دلوں کے پوشیدہ حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمزاد کے عامل ہمزاد کے ذریعہ بعض چیزیں بھی منگوا دیتے ہیں اور عامل ہمزاد ان کاموں کی وجہ سے صاحب کرامت بھی مشہور ہو جاتا ہے۔

ہمزاد کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اپنے عامل کو رات کے وقت سونے نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ ہر وقت عامل کے سامنے خبریں بیان کرتا رہتا ہے۔ اس واسطے ہمزاد کے عامل رات کے وقت سونے کے لئے یہ ترکیب کرتے ہیں کہ جب ہمزاد ان سے پوچھتا ہے کہ کچھ کام بتاؤ تو عامل کہہ دیتا ہے کہ سامنے والی املی اور کیکر کے درخت کی پتیاں گنو اور ان کا شمار مجھے بتاؤ تو بیچارہ ہمزاد ساری رات پتیاں گننے میں مصروف رہتا ہے اور عامل سو جاتا ہے۔

بعض عاملوں نے یہ ترکیب ایجاد کی ہے کہ جب وہ ہمزاد کا عمل پڑھتے ہیں اور پہلی دفعہ ہمزاد مسخر ہو کر ان کے سامنے آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ بتائیے مجھے کیوں بلایا ہے اور مجھ سے کیا کام ہے اس وقت عامل یہ کہہ دیتے ہیں کہ تو دن کے وقت میری تابعداری کر اور جو حکم میں تجھے دوں اس کی تعمیل کے واسطے حاضر رہ مگر سورج چھپنے سے سورج نکلنے تک میرے پاس نہ آ۔ چنانچہ ہمزاد ایسا ہی کرتا ہے اور وہ رات کے وقت اپنے عامل کے پاس نہیں آتا۔ اور عامل رات کو آرام سے سو سکتا ہے۔ مگر ایسا عامل ادھورا سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ رات کے وقت ہمزاد سے کوئی کام نہیں لے سکتا۔

ٹیلیفون بھی ایک ہمزاد ہے کیونکہ ہمزاد کی صفات یہ بیان کی گئی ہیں کہ وہ عامل کے کان میں بات کرتا ہے اور ٹیلیفون بھی جب کان سے لگا لیتے ہیں تب بات سنائی دیتی ہے۔ اور جس طرح ٹیلیفون رات کو سونے نہیں دیتا اور اس کی گھنٹیاں رات دن ہوتی رہتی ہیں اسی طرح سے ہمزاد بھی رات کو سونے نہیں دیتا۔ اور ہر وقت باتیں کرنی چاہتا ہے۔

ٹیلیفون کو لوہے کے سلسلہ میں داخل کرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ ٹیلیفون بجلی کی اقسام میں شمار ہونے کے قابل ہے اور بجلی کے ذریعہ ٹیلیفون میں بات ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ٹیلیفون کے وہ آلات جن کے ذریعہ بات چیت کی جاتی ہے لوہے کے ہوتے ہیں اور چونکہ لوہے کی ریل اور فوجوں کے آہنی ہتھیاروں کے

استعمال میں ٹیلیفون بھی ایک ضروری حصہ ہے۔ اس واسطے ٹیلیفون کو لوہے کی سرگذشت میں شریک کر دیا گیا ہے۔

ٹیلیفون نئے زمانہ کی اُن ایجادوں میں ہے جن سے ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ریلیں ٹیلیفون اور تار کے سہارے سے چلتی ہیں۔ فوجیں بغیر ٹیلیفون کی امداد کے میدان جنگ میں کوئی کام بھی نہیں کر سکتیں اور تجارتی کاروبار تو آجکل قطعی ٹیلیفون پر منحصر ہو گئے ہیں۔ پہلے زمانہ میں جب کوئی آدمی میل دو میل چار میل خبر بھیجنی چاہتا تھا تو سانڈنی سوار یا گھوڑے سوار کام میں آتے تھے یا ہرکارے رکھے جاتے تھے۔ مگر اب ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی ٹیلیفون کے ذریعہ ایک منٹ کے اندر بات چیت ہو جاتی ہے اور گھنٹوں کا کام چند سکنڈ میں پورا ہو جاتا ہے۔

اگرچہ ٹیلیفون کے ذریعہ بہت سی دغابازیاں اور فریب کاریاں اور گناہوں کے کام بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ٹیلیفون کی ایجاد نیک نیتی سے ہوئی ہے۔ اس واسطے ٹیلیفون کے لوہے کو نیک سرگذشت میں لکھنا چاہیئے۔ اور ٹیلیفون کے لوہے کی بیتی اس کائنات میں یقیناً بہت اچھی بیتی ہے۔ کیونکہ مسجد نماز اور عبادت کی نیت سے بنائی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص مسجد میں بیٹھکر چوری اور ڈاکہ زنی کا مشورہ کرے یا مسجد کے سایہ میں آرام لیکر شراب پیئے یا زناکاری کرے تو مسجد کے بنانے والے کو اس کا کچھ گناہ نہیں ہوگا کہ اس نے یہ مسجد نماز و عبادت کے واسطے بنائی تھی۔ ایسے ہی اگر ٹیلیفون کے ذریعہ چور چوریوں کی اطلاع دیں یا اور اسی قسم کے بُرے کام ٹیلیفون سے لئے جائیں تو ٹیلیفون کا معصوم لوہا بے قصور ہے۔

یا جس طرح بعض بے وقوف آدمی ٹیلیفون کے سوراخ پر اپنی داڑھی یا ٹھوڑی رکھدیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ میری بات دوسرا نہیں سنتا مگر میں اُس کی بات سُن رہا ہوں۔ یا کان سے لگنے والا رسیور منہ سے لگا لیتے ہیں اور منہ سے لگانیوالا آلہ کان سے لگا لیتے ہیں۔ اور پھر ٹیلیفون پر خفا ہوتے ہیں کہ اس میں آواز نہیں آتی یا بعض لوگ اسے ناجائز طریقہ سے استعمال کرتے ہیں جس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً ایک دفعہ سردی کے موسم میں رات کو بارہ بجے جبکہ خوب بارش ہو رہی

بتی حسن نظامی کے مکان میں ٹیلیفون کی گھنٹیاں ہوئیں اور ٹیلیفون ایسے کمرہ میں تھا جہاں جانے کے لئے ایک بہت بڑا صحن طے کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے جب گھنٹیاں بہت دیر تک ہوتی رہیں تو حسن نظامی مجبوراً گرم لحاف سے باہر آیا اور سردی کی تیز بارش میں بھیگتا ہوا صحن میں نکلا اور پورے صحن کو عبور کر کے ٹیلیفون کے کمرہ میں گیا۔ اور پوچھا کہ کون صاحب ہیں۔ اور ایسا کیا واقعہ پیش آیا جو آدھی رات کو آپ ٹیلیفون دے رہے ہیں۔ بولے میں دہلی کی نئی چھاؤنی سے بولتا ہوں جو آپ کے مکان سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میری آواز بارہ میل تک جا سکتی ہے۔ اسواسطے میں نے امتحاناً یہ ٹیلیفون کیا تھا۔

حسن نظامی کو یہ فقرہ سُنکر بہت تکلیف ہوئی اور اس نے کہا کہیئے آپکے یہاں بارش ہو رہی ہے۔ اُنہوں نے کہا جی ہاں بہت زور کا مینہہ برس رہا ہے حسن نظامی نے کہا۔ میں آپ کو ایک اور تجربہ کا مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس وقت کپڑے اتار ڈالیے اور ہتھر باندھ کر ایک گھنٹہ سترہ منٹ اور سترہ سکنڈ بارش میں کھڑے رہیئے۔ آج کی رات ایک خاص رات ہے اور یہ وقت نجوم کے اعتبار سے ایک خاص وقت ہے اگر آپ ایک گھنٹہ سترہ منٹ سترہ سکنڈ بارش میں کپڑے اُتار کر کھڑے رہیں گے تو آپ کا بدن پارس کا ہو جائیگا۔ اور پھر آپ جب کسی لوہے کی چیز کو ہاتھ لگائیں گے تو وہ سونا بنجائے گی۔ اور آجکل آپ کے دوستوں اور گھر والوں کو جو یہ شکایت ہے کہ آپ نہایت احمق ہیں اور نہایت بے وقوف ہیں اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ نہایت پاجی ہیں اور نہایت شریر ہیں۔ تو جب آپ پارس کے بنجائیں گے تو کوئی شخص آپ کو بُرا نہ کہیگا۔ کیونکہ آپ ہر لوہے کو سونا بنا دیا کرینگے۔ تو تمام دنیا آپ کی عزت کرنے لگیگی کہ اس دنیا میں عزت روپے پیسے کی ہے جب کسی کے پاس پیسہ نہیں ہوتا تو لوگ حقارت سے اس کا نام پرسا لیتے ہیں۔ اور جب تھوڑی سی دولت آجاتی ہے تو پرسو کہنے لگتے ہیں اور جب دولت بڑھ جاتی ہے تو خلقت اسی پرسا۔ پرسو کو لالہ پرس رام کہنے لگتی ہے۔ اسی واسطے ہنارو عقلمندوں نے کہا ہے۔

یا مایہ کے تین ہی نام
پرسا۔ پرسو۔ پرس رام

حسن نظامی کی یہ بات سنکر ٹیلیفون دینے والے صاحب بہت ناراض ہوئے اور اُنہوں نے ٹیلیفون بند کردیا۔ یہ مثال اُن لوگوں کی تھی جو اپنی ٹیلیفون کو بُرے طریقہ سے استعمال کرتے ہیں اور ٹیلیفون کے فائدہ اور اچھے استعمال کی ایک مثال بھی حسن نظامی کو معلوم ہو کہ ایک دفعہ بیماری کی حالت میں حسن نظامی نے انگریزی دوا کی چار خوراکیں ایک ہی دفعہ پی لیں اور اس کی حالت مرنے کے قریب ہوگئی۔ حسن نظامی اپنے گھر میں تھا جو دہلی شہر سے چار میل کے فاصلہ پر ہو اور جو ایک بہت چھوٹے سے گاؤں میں ہو اور اس وقت کوئی آدمی یا قرابتدار حسن نظامی کے پاس موجود نہ تھا جو ڈاکٹر کے پاس اس واقعہ کی خبر دینے جاتا۔ اس لئے زندگی کی امید جاتی رہی۔ اور حسن نظامی بیہوش ہوگیا۔ مگر اس وقت یہ ٹیلیفون کام آیا اور خواجہ بانو نے ٹیلیفون کے ذریعہ دہلی کے ڈاکٹروں کو خبریں دیں اور وہ موٹروں میں بیٹھکر اور دوائیں ساتھ لیکر پندرہ منٹ میں آگئے اور اپنے فوری علاج سے حسن نظامی کی جان بچالی۔

ٹیلیفون پولیس کے لئے کارآمد ہو اور بیحد ضروری ہو۔ پولیس اس کے ذریعہ چوروں اور بدمعاشوں کی اطلاعیں فوراً دور دور بھیج سکتی ہو اور خلق خدا کو چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ سے بچالیتی ہو۔ مگر ٹیلیفون چوروں اور بدمعاشوں کے لئے بھی کام آتا ہو۔ وہ بھی ٹیلیفون کے ذریعہ اپنے خراب کام کی اطلاعیں اپنے ساتھیوں کو دیتے ہیں۔

قصہ مختصر ٹیلیفون کا لوہا موجودہ کائنات میں انسانی ضروریات کی اتنی زیادہ کفالت کرتا ہو کہ چاندی اور سونے کی دہاتیں اس کے سامنے شرم سے سرنگوں نظر آتی ہیں۔

ٹیلیفون کا سلسلہ جست کے تاروں سے ملا ہوا ہوتا ہو گویا کرنٹ اور برقی رو جست کے تاروں میں ہوکر لوہے کے ٹیلیفون میں آتی ہو اور ہم اس کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔

ٹیلیفون کے تار باہر کھمبوں کے اوپر بھی لگائے جاتے اور زمین کے اندر بھی دبا دیئے جاتے ہیں یہ تار کھمبوں کے اوپر بلند ہو یا خاک کے اندر پست ہو ہر جگہ کام کرتا ہو نہ بلندی سے اتراتا ہو نہ پستی سے شرماتا ہو ہر جگہ مشیت الٰہی کے موافق اپنی نوکری بجالاتا ہو۔

آجکل ٹیلیفون میں اور بھی طرح طرح کی ایجادیں ہوئی ہیں مثلاً بات کرنے کے وقت بات کرنے والوں کی تصویریں بھی سامنے آجاتی ہیں آیندہ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ

کہ جو شریر اور بدمعاش ٹیلیفون میں لوگوں کو گالیاں دیا کرتے ہیں اُنکی صورت نظر آجایا کرےگی اور بیہودہ گوئی کا یہ طریقہ مسدود ہو جائیگا۔

سچ تو یہ ہی کہ نئی روشنی کی دنیا میں جو کام لوہا کر رہا ہی وہ نہ چاندی سے ہو سکتا ہے نہ سونے سے نہ ہیرے سے نہ موتی سے نہ معدنیات کی کسی اور چیز سے! اس لئے لوہا کائنات بیتی میں اپنی سرگذشت پر جس قدر فخر کرے اس کے لئے زیبا ہی۔

تار برقی

گٹ گر۔ گرگر۔ گرگٹ۔ گرگرگر۔ یہ تار برقی کے ابتدائی سبق کے الفاظ ہیں اگرچہ سننے والوں کو کھٹ کھٹ کے سوا اور کوئی لفظ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ تار برقی کے فن سے واقف ہیں وہ جب اپنے شاگردوں کو تار کا کام سکھاتے ہیں تو یہی الفاظ بتاتے ہیں اور انہی الفاظ کی آواز پر تار کے کام کی ابتدا ہوتی ہی۔

تار برقی سلسلہ کو بھی لوہے سے بہت زیادہ سروکار نہیں ہی۔ کیونکہ اس کا اکثر حصہ برق و بجلی سے تعلق رکھتا ہی اور جست کے تار اور جست کے کھمبے اس کام کے لئے زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن جس آلہ کا تعلق انسانی ہاتھ سے ہوتا ہی جس کو حرکت دینے سے برقی خبریں آتی ہیں اور جاتی ہیں وہ لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ایک چھوٹے سے آلہ میں لگا ہوا ہوتا ہی اور اس کو انسان اپنی اُنگلیوں سے حرکت دیتا ہی اور اس حرکت سے حروف بنتے ہیں اور وہ حروف بجلی کے تاروں کے ذریعہ دوسرے مقامات پر جاتے ہیں اور اُنکو لکھ لیا جاتا ہی اور اسی کو تار کہتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی جمع دہلی والوں سے پوچھو تو وہ بتا نہیں سکتے۔ جب دہلی والوں کو یہ بیان کرنا ہو کہ میں نے بہت سے تار بھیجے یا میرے پاس بہت سے تار آئے تو وہ تار کے آگے پیچھے جمع کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کچھ الفاظ لگا دینگے۔ لیکن تار کے لفظ کو جمع نہیں کر سکیں گے۔ البتہ یہ کہہ سکیں گے کہ میرے پاس تاروں کا ڈھیر لگ گیا ہی۔ یا تاروں کا تانتا لگا ہوا ہے اہل پنجاب تار کو مونث بولتے ہیں۔ دلی والا کہتا ہی "تار آیا"، اور پنجاب والا کہتا ہی "تار آئی"، دلی والا کہتا ہی "اخبار آیا" پنجاب والا کہتا ہی "اخبار آئی"، پنجاب والے تار کی جمع بھی بولتے ہیں اور اُنہوں نے ٹیلیگرام کا ترجمہ "تاریں" کیا

ہے۔ چنانچہ پنجاب کے تار گھروں میں یہ لفظ ہر جگہ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔
تار مذکر ہو یا مونث جمع ہو یا مفرد۔ پنجابی ہو یا دہلوی اسکو اس سے کچھ بحث نہیں وہ تو اس وقت لوہے کی برادری میں شریک ہو کر اپنی بیتی سُنا رہا ہے اور اپنی سرگذشت بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے لوہے کی ریل میرے بل پر چلتی ہے۔ اور دنیا کے اخبارات میرے سہارے سے جاری ہیں اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں اس عالم کثرت میں عالم وحدت کی ایک مثال ہوں کہ جب تم دہلی میں بیٹھکر کلکتہ سے بذریعہ تار برقی بات کرنی چاہتے ہو تو دہلی سے کلکتہ تک جتنے تار گھروں کا کنکشن اور سلسلہ ملا ہوا ہوتا ہے وہاں ہر جگہ تار کے کھٹکے کی آواز جاتی ہے۔ مثلاً دہلی میں تار دینے والے نے اپنی انگلی کی حرکت سے تار کے آلہ کو ہلایا اور اس سے ایک کھٹکا پیدا ہوا تو وہ کھٹکا دہلی میں بھی سُنا گیا اور شاہدرہ اور غازی آباد اور علی گڑھ اور ٹونڈلہ اور کانپور اِلہ آباد اور پٹنہ اور آسنسول اور کلکتہ میں بھی سُنا گیا۔ اور مذکورہ اسٹیشنوں کے علاوہ اُن تمام اسٹیشنوں پر بھی سُنا گیا جہاں سے دہلی کا کنکشن ملا ہوا تھا۔ یہ آواز ایک ہی وقت میں اور ایک ہی مقدار میں یکساں سُنائی دیتی ہے۔ گویا ایک حرکت اور ایک آواز سے سینکڑوں آوازیں سینکڑوں مقام پر جداگانہ سُنی جاتی ہیں۔ لیکن وہ سب آوازیں وحدت و یکتائی سے باہر نہیں جاتیں۔ سننے والے کئی مقامات کئی۔ اور جدا جدا۔ لیکن آواز ایک اور اس آواز کا ذریعہ حرکت ایک اور آواز کا وقت ایک۔ دوئی یا کثرت فقط سننے والوں کی ہے ایسے ہی ذات باری تعالیٰ اپنی تمام صفات میں واحد و یکتا ہے۔ لیکن مخلوقات کی آنکھ اپنے مشاہدہ کثرت کی وجہ سے شہود ذات و صفات کو عالم کثرت میں پاتی ہے اور دیکھتی ہے۔ ورنہ کھٹکا بھی ایک ہے اور حرکت بھی ایک ہے اور حرکت کرنے والا بھی ایک ہے۔

اس کائنات میں تمام اشیا اپنی ذات میں واحد ہیں۔ دوئی کو گنجائش ہی نہیں ہے ہمارے ہاتھ کی انگلیاں پانچ نظر آتی ہیں۔ لیکن درحقیقت پانچ نہیں ہیں۔ ہمارے ہاتھ دو دکھائی دیتے ہیں مگر دراصل دو نہیں ہیں۔ ہمارے پاؤں دو معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ بھی غلط۔ پاؤں دو نہیں ہیں۔ ہماری آنکھیں بھی دو نہیں ہیں۔ ہمارے کان بھی دو نہیں ہیں۔ ناک کے نتھنے بھی دو نہیں ہیں۔ دانت بھی بتیس نہیں ہیں۔

پاؤں کی انگلیاں بھی دس نہیں ہیں۔ اور اسی طرح جنگل کے درختوں میں جو بہت سے پتے نظر آتے ہیں نہ بھی ایک سے زیادہ نہیں ہیں اور برسات میں بارش کی بوندیں جو کروروں معلوم ہوتی ہیں وہ بھی کروروں نہیں ہیں یہاں تک کہ ایک کے سوا دوسری بوند کا نام و نشان نہیں ملتا۔

کہا جائیگا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ ہاتھ کی انگلیاں پانچ آنکھیں دو۔ کان دو۔ ناک کے نتھنے دو۔ غرض ہر چیز میں کثرت ہے وحدت نہیں ہے۔ تو میں کہوں گا کہ قصور تمہاری دید کا ہے۔ جب تم میرے سامنے اپنے ہاتھ کی پانچ انگلیاں بلند کروگے اور کہوگے لو دیکھ لو یہ تو پانچ ہیں تو میں پہلے انگوٹھے پر انگلی رکھوں گا اور کہوں گا کہ دیکھو یہ ایک۔ پھر انگشت شہادت پر انگلی رکھوں گا اور کہوں گا یہ بھی ایک اور اس کے بعد درمیانی انگلی پر انگلی رکھوں گا۔ اور کہوں گا یہ بھی ایک اور پھر اس کی برابر والی انگلی پر انگلی رکھوں گا اور کہوں گا یہ بھی ایک۔ اس کے چھوٹی انگلی پر انگلی رکھونگا اور کہونگا یہ بھی ایک اسی پر باقی چیزوں کو بھی قیاس کرلو کہ جب تم کہوگے کہ کان دو ہیں تو میں دائیں کان پر انگلی رکھکر کہوں گا کہ دیکھو ایک اور پھر بائیں کان پر انگلی رکھکر کہوں گا کہ دیکھو یہ بھی ایک اور پھر دائیں آنکھ پر انگلی رکھکر کہوں گا کہ یہ بھی ایک اور بائیں آنکھ پر انگلی رکھکر کہوں گا یہ بھی ایک اور بتیس داڑھ دانتوں کو دکھا کر کہوں گا کہ یہ بھی ایک یہ بھی ایک یہ بھی ایک .... کہتا جاؤں گا اور ہر دانت پر انگلی رکھتا جاؤں گا۔ پھر دایاں ہاتھ اٹھاؤنگا اور کہونگا دیکھو ایک۔ پھر بایاں ہاتھ اٹھاؤنگا اور کہونگا دیکھو یہ بھی ایک۔ پھر دایاں پاؤں ہلاؤنگا اور کہوں گا دیکھو یہ بھی ایک پھر بایاں پاؤں ہلاؤنگا اور کہوں گا دیکھو یہ بھی ایک اور پاؤں کی انگلی بھی ایک اور سب درختوں کا پتا پتا بھی ایک اور بارش کی ہر بوند اپنی اپنی ذات میں واحد و منفرد۔

اس کائنات میں جب تم وحدت وجود کی نگاہ حاصل کرلوگے تو نظر ایک ہی پر جائے گی اور ایک ہی کو پائے گی۔ کیونکہ موجودات عالم میں ہر چیز اپنے وجود میں یکتا و مکمل ہے۔ پانچ روپے میرے سامنے لاؤ اور دیکھ لو کہ ہر روپیہ اپنی ذات میں واحد و منفرد ہے۔ جب تم پانچ متعین اور واحد و منفرد ہستیوں کو ایک جگہ

لاتے ہو تو کثرت ہو جاتی ہے اور پھر ان پانچ وجودوں کو لفظ واحد پانچ سے مخاطب کرتے ہو تو وحدت سے کثرت اور کثرت سے وحدت ہو جاتی ہے۔ یہی حال تار کے کھٹکا کا ہے کہ وہ حقیقت میں ایک ہے۔ لیکن سننے والوں کو دہلی سے کلکتہ تک بے شمار سنائی دیتے ہیں۔ مگر نہ وہاں دوئی اور کثرت ہے نہ یہاں۔

اور یہ بھی سمجھا کہ جو تار کے فن سے واقف نہیں ہیں انکو تار گھر میں سوائے کھٹ کھٹ کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اور وہ نہیں جانتے کہ اس کھٹ کھٹ میں کیا کیا معانی اور کیا کیا اسرار پوشیدہ ہیں۔ لیکن تار کا فن جاننے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کھٹ کھٹ میں یہ خبر آئی کہ فلاں شخص کو ایک لاکھ روپے کا فائدہ ہوا اور اس کھٹ کھٹ میں خبر آئی کہ فلاں شخص کو ایک لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ بچہ پیدا ہونے کی خبر بھی اسی کھٹ کھٹ میں ہے اور بچہ مرنے کی خبر بھی اسی کھٹ کھٹ میں ہے غرض دنیا کے تمام خیر و شر کے معاملات اس کھٹ کھٹ میں پوشیدہ ہیں۔ مگر جو جانتے ہیں وہ کہتے نہیں، جو کہتے ہیں وہ جانتے نہیں۔

لوہے سے پوچھو وہ کہیگا کہ تار برقی کے ہنر میں اگرچہ میرا بہت کم دخل ہے لیکن جتنا دخل ہے وہ ایسا پورا اور مکمل ہے کہ بغیر لوہے کے تار برقی کے کاروبار چل نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ لوہے کے اور جتنے کاروبار ہیں خصوصاً ریل کا کارخانہ وہ بغیر تار برقی کے ادھورے اور ناقص ہیں۔ اور تار برقی نے ڈاکخانہ کے کام کو بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ اور انسانوں میں مسافت کی وجہ سے جو ہجر و فراق واقع ہو گیا تھا اس کو بھی تار برقی نے دور کر دیا ہے۔ اب بمبئی کا باشندہ تار برقی کے ذریعہ پشاور سے اتنا ہی قریب ہے جتنا پشاور کا باشندہ اپنے برابر بیٹھنے والے سے قریب ہوتا ہے۔

برق کے تاروں میں ہے تصویر یار

جب ذرا انگلی ہلائی دیکھ لی

دیوانے تھے فرعون کے زمانہ والے بے عقل تھے ہندوستان اور یونان والے۔ جنہوں نے چاند سورج اور زمین سے دور کے سیاروں کو معبود بنا لیا اور پتھر کے بت تراش لئے اور دریاؤں کے پانی کو پوجنے لگے اور درختوں کے آگے سر جھکانے لگے۔ اگر وہ اپنے انسانی دماغ کی قابلیت پر غور کرتے اور ان کو

لوہے کی حقیقت معلوم ہو جاتی اور وہ بھی لوہے سے ایسا ہی کام لینے لگتے جیسا کہ آج کل لیا جا رہا ہے تو انکو شرک اور بت پرستی اور غیر پرستی کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور وہ پہلے اپنے وجود کو پہچانتے ہیں اور انسانی کمالات پر فریفتہ ہوتے اور پھر اپنے وجود کے خالق اور انسان کے پیدا کرنے والے خدا کے آگے سر جھکا دیتے۔

ارے او لوہے . ارے او حدید

ارے او آہن ارے او آئرن

سُن بات سُن بیشک اس وقت تو بڑے کام کر رہا ہے۔ بلاشبہ اس وقت انسان کے اور کی زندگی کے بہت سے کام تیرے وجود سے وابستہ ہو گئے ہیں اور تیری بیتی اور تیری سرگذشت اس عالم امکان میں اور موجودات کائنات میں ایک شاندار بیتی اور شاندار سرگذشت ہے مگر یاد رکھ کہ تو ایک ناچیز مخلوق ہے اور خاک سے نکلا ہوا ایک ذلیل میل ہے۔
جب تجھکو لوہار بھٹی کے اندر ڈالتا ہے تو آگ کی ہم نشینی تجھکو آگ بنا دیتی ہے اگر تو اس وقت یہ دعوے کرے کہ میں آگ ہوں اور منصور کے دعوائے انا الحق کی طرح نعرہ لگائے کہ انا النار ! انا النار ! تو تیرا کہنا اور تیرا نعرہ غلط نہیں ہوگا کیونکہ تیری شکل بھی آگ کی اور تیرا کام بھی آگ کا۔ لیکن بھٹی سے باہر آنے کے بعد جب تجھ سے آگ کی ہم نشینی کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور تیری صورت لال سے کالی اور تیری خاصیت گرم سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو پھر تو ناچیز لوہے کا لوہا رہ جاتا ہے لہذا اپنی اصل کو نہ بھول اور دنیا کے عارضی کارناموں کو اپنی ذات سے منسوب نہ کر کہ یہ سب کھیل تو اس ذات کے ہیں جس نے تجھکو اور دنیا کی اس تماشہ گاہ کو پیدا کیا ہے۔

ٹرام

شہروں میں دوڑنے والی اور تھوڑے خرچ پر شہری مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے والی گاڑی کا نام ٹرام ہے۔ یہ بھی ریل کی طرح لوہے کی سڑک پر چلتی ہے۔ اس میں آگ پانی بھاپ کا کچھ دخل نہیں ہے۔ بجلی کے ذریعہ مسافروں کو لاتی ہے اور لیجاتی ہے۔ یہی وہ سواری ہے جس نے شہروں کے باشندوں کی تندرستیاں خراب کر دی

ہیں۔ جب تک ٹرام شہروں میں جاری نہیں ہوئی تھی غریب لوگ پیدل چلتے پھرتے تھے اور اُن کی تندرستیاں بہت اچھی تھیں۔ مگر جب سے ٹرام جاری ہوئی ہی لوگ کاہل وجود ہوگئے۔ رستہ چلنا بھول گئے اور جب دس قدم جانا ہوتا ہی تو دس منٹ تک ٹرام کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔

اس نقصان کے علاوہ باشندوں کی جان اور جسم کا نقصان بھی ٹرام سے بہت ہوتا ہی۔ کیونکہ روزانہ انسان اور جانور ٹرام سے ٹکراتے ہیں اور زخمی ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔ خاصکر چھوٹے بچوں کا اس گاڑی سے بہت نقصان ہوتا ہی۔

نقصانوں کے علاوہ ٹرام کے فائدے بھی بہت ہیں اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہی کہ دور و دراز بازاروں اور محلوں میں جانے کے لئے ایک آنہ کرایہ دیکر بہت جلدی پہنچ جاتے ہیں۔ نئے زمانہ کی جتنی سواریاں ایجاد ہوئی ہیں اُن سب میں وقت کی بچت کا اصول پیش نظر رہتا ہی۔ ریل گاڑی۔ موٹریں۔ موٹر سائکلیں اور سادہ سائکلیں اور ٹرام وغیرہ سب تیز رفتار سواریاں اسی واسطے ایجاد کی گئی ہیں کہ رستہ جلدی طے ہو۔ اور انسان کا قیمتی وقت زیادہ خرچ نہ ہو اور تھوڑے وقت میں بہت سا کام ہو جائے لیکن جو قومیں وقت کی قدر جانتی ہیں وہی ان سواریوں سے وقت بچانے کا کام لیتی ہیں ورنہ بے شمار آدمی وقت کے کھونے کے لئے ان سواریوں کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اکثر بیکار لوگوں کا یہ شغلہ ہی کہ وقت گذاری کے لئے ریل میں اور موٹروں میں اور ٹرام میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جس طرح ہندوستان کے راجہ نواب وقت گذارنے کے لئے کہانیاں کہنے والے نوکر رکھتے ہیں۔ تاکہ راجہ صاحب اور نواب صاحب کو بیکار وقت دوپہر معلوم نہ ہو اسی طرح سے یہ سواریاں بھی وقت گذاری کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

موجودات کائنات میں ٹرام گاڑی اپنی بیتی اور اپنی سرگذشت سنانی چاہی تو وہ یہ کہیگی کہ میں لوہے کی سڑک پر چلتی ہوں۔ لوہے کے پہیئے مجھکو چلاتے ہیں لوہے کی ایک پھر کی بجلی کے تار سے لگی رہتی ہی اور وہاں سے بجلی ٹرام کے پہیوں میں آتی ہی اور ٹرام کو چلاتی ہی۔ گویا میں ٹرام اوپر سے بھی لوہا ہوں اور نیچے سے بھی لوہا اور میری رفتار کا سب دارومدار جنس آہن پر ہی۔

شہروں میں ہزاروں قسم کی شورشیں ہیں اور طرح طرح کے غل شور ہیں انہیں شورشوں اور غل شور میں ایک مجھہ ٹرام کی شورش بھی ہے کہ صبح ۶ بجے سے آدھی رات تک میں برابر چلتی رہتی ہوں اور میرے آنے جانے کی ایسی گھڑگھڑاہٹ ہوتی ہے کہ سڑک کے قریب رہنے والے آدمیوں کی زندگی میری آواز سے دوبھر ہو جاتی ہے اور جو شخص سکون اور سکوت کی زندگی تلاش کرتا ہے اس کو میری آواز کسی وقت بھی چین نہیں لینے دیتی۔

میں نئی روشنی کی ایجاد ہوں اور نئی روشنی کی ہر چیز اپنے مالک کے لئے راحت رساں ہے اور دوسروں کے لئے آزار دہندہ۔ چنانچہ موٹر جب چلتی ہے تو تمام رستہ میں خاک اُڑاتی ہوئی چلتی ہے اور موٹر کی پشت پر پاؤ میل تک ہوا میں خاک ہی خاک کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن موٹر کے اندر بیٹھنے والی سواریاں اس گرد و غبار سے بچی رہتی ہیں۔ یہی حال ریل کا ہے کہ وہ بھی جب شہری آبادیوں کے قریب سے گذرتی ہے تو سونے والوں کی نیند برباد کر ڈالتی ہے اور ایسے ہی ٹرام ہے کہ اس کی آواز بھی شہر والوں کے کانوں کو ہر وقت بے اطمینان رکھتی ہے۔

نئی روشنی نے عناصر کو مقید کرکے یہ چیزیں ایجاد کی ہیں۔ اور یہ سب آوازیں جو ان سواریوں سے پیدا ہوتی ہیں یہ درحقیقت اُن عناصر کی فریاد ہے جنکو انسان نے مقید کرکے اپنی خدمت میں لگا لیا ہے۔

ایک دفعہ لوہے سے پوچھا جبکہ وہ آگ کی بھٹی میں لال ہو رہا تھا اور بھٹی سے نکالنے کے بعد لوہے پر پانی ڈالا گیا تو لوہے سے ایک چیخ نمودار ہوئی۔ اور اس کے بعد لوہا ٹھنڈا ہو گیا تو پوچھا گیا۔ کہ اے لوہے! جب تو آگ میں جل رہا تھا تو خاموش تھا اور مطمئن تھا۔ لیکن جب تجھے آگ سے باہر نکالا گیا اور ٹھنڈا پانی تجھ پر ڈالا گیا تو تیرے اندر سے شکایت اور تکلیف کی ایک چیخ پیدا ہوئی۔ اس کا کیا سبب ہے۔ لوہے نے جواب دیا یہ چیخ فقط مجھ ہی سے نہیں نکلتی بلکہ ہر چیز جب آگ میں جلائی جائے اور پھر اس پر پانی ڈالا جائے تو اس کے اندر سے ایک چیخ اور ایک دردناک آواز پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہم سب کائنات کی زندگی میں مقید ہونے کے بعد اس کے متلاشی رہتے ہیں کہ زندگی کی یہ کشمکش ختم ہو اور ہم کو کائنات کے اندر موجود رہتے اور جامہ ہست کی

قید سے رہائی ملے۔ اور جب ہم آگ میں جلائے جاتے ہیں تو ہمیں امید ہو جاتی ہے کہ اب کشمکش حیات اور وجود کی موجودگی کی ذمہ داری سے نجات مل جائے گی۔ کیونکہ آگ ہر وجود موجود کو اپنی حرارت سے نابود اور غیر موجود کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے لکڑ جلنے کے بعد اپنا عظیم الشان تن و توش نیست و نابود کر کے مشت خاک رہ جاتے ہیں اور ایسا ہی دوسری اشیا بھی۔ یہانتک کہ میں لوہا بھی آگ میں جلتے جلتے رفتہ رفتہ نیست و نابود ہو جاتا ہوں۔ اس واسطے جب ہم کو آگ سے نکال لیا جاتا ہے اور ہم پر پانی ڈالا جاتا ہے تو ہم سب چیختے ہیں اور ہمارے اندر سے ایک بے تابانہ آواز نکلتی ہے کہ اے انسان تونے غضب کیا۔ تونے بُرا کیا کہ ہمکو نیست و نابود ہونے سے بچا لیا اور ہست کی دنیا میں پانی ڈالکر پھر واپس بلا لیا۔ ہم چاہتے تھے کہ جلدی فنا ہو جائیں اور ہمکو کائنات کے وجود سے چھٹکارا مل جائے۔ جس میں ہم پروردگار کے لفظ کن کے سبب اسیر و مقید ہو گئے ہیں۔

اگر لوہے وغیرہ اشیا سے یہ کہا جائے کہ آگ تم کو معدوم کہاں کرتی ہے۔ فقط تمہاری صورت اور ہیئت بدلدیتی ہے تو یہ اشیا جواب دیتی ہیں کہ ہمارے اجسام کی ضخامت اور عظمت اور بڑائی کا کم ہو جانا بھی ایک طرح کی آزادی ہے۔ کیونکہ اس کائنات میں بڑا ہونا ایک قید ہے اور چھوٹا بننا ایک آزادی ہے۔ دیکھو جب آندھی آتی ہے تو بڑے بڑے تنومند درخت جڑ سے اُکھڑ جاتے ہیں اور یا اُن کے ڈالے اور ڈالیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑتی ہیں۔ مگر چھوٹے چھوٹے درخت اور چھوٹے چھوٹے پودے اور چھوٹی چھوٹی گھاس اس آندھی کے طوفان سے محفوظ رہتی ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں حوادث کا حملہ انہی پر ہوتا ہے جو زیادہ اونچے ہوں اور جو زیادہ تنومند ہوں۔

میں ٹرام گاڑی اچھی ہوں یا بُری نقصان رساں ہوں یا مفید بہرحال ایک سرگذشت رکھتی ہوں اور انسان کے لئے میرے آہنی پہیئے صبح سے رات تک برابر زمین پر سر رکھے ہوئے لُڑکتے رہتے ہیں اور لوہے کی سڑک رات دن ان پہیوں کو اپنے سینہ پر دوڑنے اور روندنے کی اجازت دے کر پامال ہوتی رہتی ہے۔

میں ہی وہ چیز ہوں جس کے ذریعہ سینکڑوں آدمیوں کو روزی ملتی ہے۔ ٹرام چلانیوالے اور ٹرام میں ٹکٹ بانٹنے والے اور ٹرام کے دوسرے سب کام کرنے والے رات دن میری خیر مناتے ہیں کہ میرے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اُنکو رزق دیتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ میرے اندر امیر غریب ادنیٰ اعلیٰ۔ عالم وجاہل گورے اور کالے عورت ومرد بچے اور بوڑھے سب ہی مساوات کی شان سے سوار ہوتے ہیں اور میرے اندر بیٹھنے کے بعد کوئی اعلیٰ ذات کا آدمی ادنیٰ ذات کے آدمی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو حقیر وذلیل ہے میرے ساتھ اس گاڑی میں نہ بیٹھ۔ میرے ہاں صرف کرایہ درکار ہے اور کسی چیز کی پوچھ نہیں ہے۔ جو شخص کرایہ دینے کی حیثیت رکھتا ہے وہ مجھ میں سوار ہو سکتا ہے چاہے وہ کسی حیثیت اور کسی درجہ اور کسی قابلیت کا آدمی ہو۔

مجھ سے اگر شہریوں کی جان کو نقصان پہنچتا ہے تو اس میں میری کچھ خطا نہیں ہے کیونکہ میں جب چلتی ہوں تو میری آواز دور سے سنائی دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی میں برابر گھنٹی بھی بجاتی رہتی ہوں۔ لیکن رستہ چلنے والے خود اپنی جان کی حفاظت سے بے خبر ہیں اُن کے لئے الگ راستے بنا دئے گئے ہیں جہاں اُنکو چلنا چاہیئے مگر وہ روزانہ مرتے ہیں اور زخمی ہوتے ہیں پھر بھی اُن کی غفلت دور نہیں ہوتی اور وہ آنکھیں بند کرکے اور کانوں کو خطرہ کی آوازوں سے غافل اور بے خبر بنا کر میرے سامنے آجاتے ہیں اور پھر اگر اُنہیں کچھ تکلیف پہنچتی ہے تو یہ اُن کا قصور ہے میرا نہیں ہے۔

سڑک بنانے کا انجن

ذرا بچکر چلیئے میں سڑک بنا رہا ہوں۔ اور کیچڑ اڑا رہا ہوں اور غل مچا رہا ہوں میرا نام "رولر" ہے۔ میں سڑک پر پڑے ہوئے اونچے نیچے پتھروں کو دبا دیتا ہوں اور سب کو ایک سطح بنا دیتا ہوں انسان باہمی اتحاد اور مساوات کیلئے زبان سے تقریر کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ میرا کام بھی مساوات قائم کرنے کا ہے۔ لیکن میں وعظ نہیں کہتا لیکچر نہیں دیتا اور پتھر کے اُن روڑوں کی خوشامد نہیں کرتا جو چھوٹے روڑوں سے اونچے ہو کر اپنی سربلندی کا دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ میری تقریر تو ایک طاقت اور ایک زور ہے اور اس میں ایک وزن ہے میں خاموشی کے ساتھ پتھروں اور روڑوں کے سر پر آتا ہوں اور سب سرکشوں کو آن

کی آن میں دبا ڈالتا ہوں اور دو چار دفعہ دبانے کے بعد ہر چھوٹا بڑا پتھر ایک لیول میں اور ایک سطح میں آجاتا ہے میں آگ پانی کی طاقت سے چلتا ہوں لیکن سر سے پاؤں تک لوہے کا ہوں اور میں کہاں ہوں بس لوہا ہی لوہا ہے۔ جس چیز کو لوگ انجن کہتے ہیں سڑک کوٹنے کا رولر نام دیتے ہیں وہ سر سے پاؤں تک لوہا ہی کائنات میں جتنے نام ہیں وہ سب شکلوں کے ہیں اور شکلیں حقیقت کے لحاظ سے موہوم اور نابود ہیں۔ سونے کا ایک چھلا اگر یہ دعوے کرے کہ میرا نام چھلا ہے اور میں ایک موجود چیز ہوں اور سونا اس کو جواب دے کہ جس شکل کا نام چھلا ہے اس سے الگ ہو جائے اور میں سونا الگ ہو جاتا ہوں تو بتاؤ سونے کی جدائی کے بعد چھلے کی کوئی ہستی باقی رہیگی یا نہیں؟ یہی حال ہر شکل کا ہے چاہے وہ مٹی کی ہو یا گوشت کی یا لکڑی کی یا کسی دھات کی کہ سب کے نام مقررہ صورتوں کے موافق رکھے جاتے ہیں اور صورتیں اس جنس کے بغیر جس سے وہ تیار ہوئیں اپنی ذات میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ لوہے کا چھلا لوہے کی سوئی لوہے کی تلوار لوہے کی بندوق لوہے کی توپ جن اشکال کے نام ہیں ان سب کی یہی کیفیت ہے کہ سوئی بھی لوہا تلوار بھی لوہا۔ اور توپ اور بندوق بھی لوہا۔ لیکن جب تک لوہے کی شکل سوئی کی ہے اس کو سوئی کہیں گے اور جب لوہا تلوار کی صورت میں آیا اور بندوق اور توپ کی شکل میں نمودار ہوا تو ان شکلوں کا تلوار اور توپ اور بندوق نام رکھا جائیگا۔ لیکن حقیقت ان سب شکلوں کی اور وہ ان سب صورتوں کا لوہا ہوتا ہے۔ لوہے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اگر لوہا ان صورتوں سے علیحدہ ہو جائے۔ تو بتاؤ ان شکلوں کی حقیقت کہاں باقی رہی۔

سڑک کا انجن نام ہے لوہے کے چند پرزوں کا۔ دو چوڑے پہیئے آگے ہوتے ہیں جو آپس میں ملے رہتے ہیں اور ان کی شکل ایک بیلن کی ہوتی ہے اور دو اونچے پہیئے پیچھے ہوتے ہیں۔ اور یہ سب لوہے سے ڈھالے جاتے ہیں۔ سڑک پر کنکر یا لوہے کی روڑی ڈالکر اس پر مٹی بچھائی جاتی ہے۔ اور پانی ڈال کر انجن کو اوپر پھرایا جاتا ہے۔ جس سے سڑک دبکر ایک سطح بن جاتی ہے۔

اے بزم کائنات کے موجودہ بھائیو! مجھ لوہے کی بیتی تمہارے سامنے ہے اس کو مفید سمجھو یا غیر مفید۔ مجھے اس سے بحث نہیں۔ میں تو پہلے ایک موٹی نوکدار کدال سے جو میرے ساتھ باندھ دی جاتی ہے سڑک کو کھود ڈالتا ہوں۔ اس کے

بعد سڑک کو بنا دیتا ہوں۔ تاکہ انسان اپنی سواریوں کو آسانی کے ساتھ ہم سطح سڑک پر چلا سکیں جب تک میری ایجاد نہیں ہوئی تھی انسان کو سڑکوں کے ہموار کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں لیکن اب نہایت آسانی سے ہر ہر مقام پر بہت جلدی سڑکیں بنا دیتا ہوں۔ اور یہی میری سرگذشت ہے۔

کدال

میں بہ شکل ہلال فٹ بھر سے چھوٹا لوہے کا ایک آلہ ہوں جس سے آدمی مٹی کھودتا ہے دیواریں توڑتا ہے اور اسی قسم کے بے شمار کام لیتا ہے۔ میں لوہے کی ہوں اور میری ہستی میں تعمیر و تخریب دونوں پوشیدہ ہیں اور میری سرگذشت دنیا کی ابتدا سے انتہا تک یکساں رہی ہے اور یکساں رہے گی۔

پھاوڑہ

میں کدال کا بھائی ہوں چوڑا چکلا میرا کام مٹی کاٹنا اور تعمیرات کا مسالہ سمیٹنا اور وہ سب چیزیں ہیں جنکی تعمیر و تخریب میں ضرورت پیش آتی ہے۔
لوہے کا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ خدا نے مجھے اُس جنس سے بنایا جو اس کی کائنات کی اشیاء میں بہت مفید اور کار آمد جنس مانی گئی ہے اور میرا اتنا ہی بیان کافی ہے۔

بسولی

میں بھی لوہے کی ہوں معمار کے ہاتھ میں رہتی ہوں وہ مجھ سے ٹیڑھی اینٹوں کو چھیل چھیل کر اور توڑ توڑ کر سیدھا اور ہموار کرتا ہے میری سرگذشت میں پہلے تخریب ہے اور پھر تعمیر ہے اور آرائش ہے مجھے فخر ہے کہ مجھے لوہے سے بنایا گیا اور اس جنس میں شریک کیا گیا جو مخلوقات الٰہی کے لئے کام آتی ہے۔

کرنی

لوہے سے بنی ہوں معمار کے ہاتھ کی تلوار ہوں یا برچھی کی اَنی ہوں میرا کام تخریب کا بہت کم ہے۔ میں تو زیادہ تر تعمیر کے کام آتی ہوں معمار مجھ سے چونا اور گارہ اور مسالہ اٹھا کر

تعمیری کام کرتا ہے اور دنیا میں جتنی بڑی بڑی عمارتیں اور اُن کی استرکاریاں نظر آتی ہیں وہ سب میرے ہی دم سے ظاہر ہوئی ہیں۔ میں کائنات کی بیتی ہوں۔ اپنی خدمات کا کیا ذکر کروں۔ عمارات عالم مجھ ناچیز کے کاموں کو خود ہی ہر جگہ پیش کر رہی ہے۔

آری

لوہے کا ٹکڑا ہوں۔ نیم کے پتے کی طرح انسان نے میرے منہ پر دندانے بنائے ہیں تاکہ میرے ذریعہ وہ بڑی چھوٹی لکڑیوں کو کاٹے۔ میں جب لکڑی کے سر پر چلتی ہوں تو آن کی آن میں اس کو چیر کر رکھ دیتی ہوں۔ جب آرہ کش مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے تو لکڑی کا برادہ کاٹ کر آرہ کش کے آگے ڈال دیتی ہوں اور جب وہ آرہ کو اور آری کو دوسری طرف لیجاتا ہے تو لکڑی کا برادہ دوسری طرف پھینک دیتی ہوں۔ گویا میری خاصیت فیض عام کی ہے کہ ہر رُخ فیاضی کے ساتھ لکڑی کا برادہ تقسیم کرتی رہتی ہوں۔

چھوٹی آری ہوں مجھ سے بڑا ایک آرہ بھی ہوتا ہے وہ بڑے بڑے درختوں کو چیرتا ہے۔ میں چھوٹی لکڑیوں کو پاش پاش کرتی ہوں۔ جب انسان مجھکو لکڑی کے سر پر چلاتا ہے تو اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ میں کس بے دردی کے ساتھ ایک جسم کو چیر رہا ہوں اور جب حضرت ذکریا پیغمبر کو آرہ سے چیرا گیا تب بھی انسان کو رحم نہ آیا۔ مگر یہ بے رحمی انسان کے نامۂ اعمال میں ہے مجھ آری اور آرہ کا اس میں کچھ قصور نہیں ہے۔ ہم دونوں کو تو لوہے سے اس لئے بنایا جاتا ہے کہ انسانی تعمیرات میں مددگار ہوں ہم لکڑیوں کو چیر چیر کر چھتوں کی کڑیاں اور تختے اور دروازوں کے کواڑ اور کتابوں کی الماریاں اور ہر قسم کے اوزاروں کے دستے اور میز کرسیاں وغیرہ بناتے ہیں اور ہماری سرگذشت اور بیتی موجودات کائنات میں شروع سے اخیر تک خدمت مخلوق ہے اور میں اپنی جنس لوہے کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے دنیا کے شروع سے اس وقت تک مخلوقات الٰہی کی بہت سی خدمات انجام دی ہیں۔ اور اگر مجھ سے انسان نے کوئی برا کام لیا تو یہ اس کی خطا ہے۔ کیونکہ قدرت نے مجھے انسان کا تابعدار بنا دیا تھا۔

بسولہ

میں بھی لوہے کا ہوں۔ ایک دھاردار آلہ ہوں لکڑی چھیلنے کا کام کرتا ہوں۔ میری

خاصیت آری اور آرہ کی طرح فیاضانہ نہیں ہے۔ آری اور آرہ اپنے کام کے وقت لکڑی کا برادہ مشرق و مغرب شمال و جنوب ہر سمت اڑاتے ہیں اور برساتے ہیں مگر میں جب لکڑی کو چھیلتا ہوں تو اپنے ہی آگے ڈالتا ہوں۔ اس واسطے خود غرض بخیل اور کنجوس بسولہ کہلاتا ہوں۔

میری جنس لوہا ہے۔ اور اس کو معلوم ہے کہ میں نے دنیا کے شروع سے آجتک بے شمار کام خدمت خلق کے کئے ہیں اور لکڑی کے سب کام میرے ذریعہ سے انجام کو پہنچتے ہیں اور انسان میری خدمات کی شہادت دے سکتا ہے۔

رَنْدَہ

میں لوہے کی ایک دھاردار چیز ہوں میری دھار لکڑی کے حجاب میں پوشیدہ رہتی ہے اور جب تختہ کو صاف کرنا مدنظر ہوتا ہے تو مجھے لکڑی کے چہرہ پر زور زور سے پھیرتے ہیں اور میں لکڑی کا چہرہ اس طرح صاف کر دیتا ہوں جس طرح استرہ کرزن فیشن کے انسانوں کا چہرہ صاف کر دیتا ہے۔ میں اس کائنات میں اپنے کام اور سرگذشت کے لحاظ سے نادم اور شرمندہ نہیں ہوں اور لوہے کی جنس میرے وجود پر بھی فخر کر سکتی ہے۔ کیونکہ ہر لکڑی کی صفائی اور خوشنمائی میرے عمل کے ذریعہ ہوتی ہے۔

کوہاڑی۔ کوہاڑا

میں بھی لوہے کی۔ کوہاڑا بھی لوہے کا۔ کوہاڑا بڑی بڑی موٹی موٹی لکڑیوں کو چیرتا پھاڑتا ہے اور میں چھوٹی لکڑیوں کو۔ شاخوں کو۔ ڈالیوں کو کاٹتی چھانٹتی ہوں۔

انسان کبھی کبھی مجھے قتل و خونریزی کے کام میں بھی لاتا ہے اور مجھے اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ مگر میں بے گناہ ہوں مجرم انسان ہے۔ مجکو تو مخلوق کی راحت رسانی کے لئے بنایا جاتا ہے۔ پھر اگر کوئی شخص مجھ سے ایذارسانی کا کام بھی لے تو یہ اس کا قصور ہے میری خطا نہیں ہے۔

کیلیں

ہم لوہے کی اولاد ہیں اور عمارتوں میں لکڑی جوڑنے کے لئے جس قدر کیلیں۔ چھیکے

پینچ ۔ کھٹکے ۔ وغیرہ سامان درکار ہوتا ہے وہ بھی سب لوہے کی نسل سے ہے۔ ہمکو لکڑی کے وصل کے لئے بنایا جاتا ہے اور ہم لکڑی کے وصال کا ذریعہ بنتے ہیں۔ تمام دنیا کی عمارتیں اور لکڑی کی چیزیں ہم کیلوں ۔ کوکوں چٹخنیوں کانٹوں وغیرہ کی ممنون احسان ہیں۔

پانی کے نل

ہم کو لوہے سے بنایا جاتا ہے۔ ہم بڑے چھوٹے منجھولے ہر قسم کے بنتے ہیں اور انسان کی سیرابی کے لئے خاک میں دبتے ہیں اور پھر سڑکوں اور گلیوں میں کھڑے ہوکر انسان کو رات دن پانی دیتے ہیں اور ہماری سرگذشت اس کائنات میں لوہے کی انسانی خدمات کو چار چاند لگاتی ہے۔ کیونکہ پانی ہی وہ چیز ہے جو ہر چیز میں زندگی پیدا کرتا ہے اور ہم ہی وہ نل ہیں جو پانی کو ہر جگہ پہنچاتے ہیں۔

پانی کی ٹنکی

میں بھی لوہے کی ہوں ریل کے اسٹیشنوں پر مجھکو پانی سے بھر کر رکھا جاتا ہے۔ گویا میں پانی کا ایک بڑا حوض بنجاتی ہوں جس سے رات دن انسان و حیوان کو اور ریل کے مسافروں کو پانی ملتا رہتا ہے۔ اس واسطے کائنات کی مجلس میں میری خدمات کی سرگذشت جنس آہن کے لئے ہر طرح قابل فخر ہے۔

لوہے کا ڈول

میں ہندوؤں کے لئے بنایا جاتا ہوں جو چمڑے کا ڈول استعمال کرنا گناہ اور مہا پاپ سمجھتے ہیں۔ میری سرگذشت میں بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جب سے بنتا ہوں اس وقت سے لیکر عمر کے آخر تک مخلوق خدا کو کوئیں سے بھر بھر کر پانی پلانا میرا کام رہتا ہے اور لوہے کی جنس بزم کائنات میں میری سرگذشت کو بھی پیش کر سکتی ہے۔

سلائی کی مشین

کھٹ کھٹ کھٹ ۔ گرگرگر۔ یہ سلائی کی مشین کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ یہ مشین سنگر کے کارخانہ کی ہے یا کسی اور کمپنی کی۔ ذرا دیکھنا کس چیز سے بنی ہے اور کیوں بنی ہے۔ جناب یہ

تو لوہے کی ہی۔ سر سے پاؤں تک ہر چیز اور ہر پرزہ لوہے سے تیار ہوا ہی۔ اور اس کے بنانے کا مقصد یہ ہی کہ انسان ہر موسم کے کپڑے اس مشین کے ذریعہ سینے اور اپنی برہنگی کو دور کرے پہلے جب یہ مشینیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں تو جو کپڑا آٹھ دن میں سلکر تیار ہوتا تھا۔ اس کو یہ مشین آٹھ گھنٹہ میں تیار کر دیتی ہی۔ اور ذرا سُننا وہ کہہ رہی ہی کہ میں جنس آہن سے بنی ہوں اور مجھے فخر ہی کہ میں ہر قوم اور ہر ملک کے انسانوں کی تن پوشی کے کام آتی ہوں۔ اور کوئی حرکت کسی کو نقصان یا ایذا پہنچانے کی مجھ سے نہیں ہوتی۔ اور بزم کائنات میں میری بیتی ایک اچھی سرگذشت ہی۔

سوئی

ذرا خیال کرنا کیسی ننھی منی چھوٹی سی چیز ہی کیسی چمکدار ہی اور کیسی نوکیلی ہی۔ اور کیسی نازک اندام ہے۔ یہ بھی کپڑوں کی سلائی کے کام آتی ہی۔ چھوٹے بچے اسی کی پہیلی کہا کرتے ہیں کہ "چھوٹی سی گڑیا جس کی سوا گز کی چوٹیا" کیونکہ سوئی کے ناکہ میں سلائی کے وقت جو ڈورا ڈالا جاتا ہی وہ سوئی کے قد سے بہت زیادہ بڑا ہوتا ہی۔ سوئی بھی جنس آہن کے لئے قابل فخر وجود ہی اور اُس کی سرگذشت میں خدمت خلق اللہ کے سوا اور کوئی برائی نہیں ہی۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھی نازک اُنگلیوں میں چبھ جاتی ہی اور نازک اُنگلیوں والے "سی" کرکے چونک پڑتے ہیں اور ان کی انگلیوں سے خون کی بوند ٹپک جاتی ہی۔ اور کبھی یہ سوئی جسم کے کسی حصہ یا تلوے کے اندر چبھ کر بدن میں غائب ہو جاتی ہی اور خون کے ساتھ سارے جسم میں دوڑتی پھرتی ہی اور کبھی کبھی انسان کی ہلاکت کا باعث بنجاتی ہی۔ مگر اس میں سوئی کی کچھ خطا نہیں ہی بلکہ یہ انسان کی غفلت اور بے احتیاطی کی سزا ہی۔

قینچی

لوہے کی بیٹی ہی۔ دو زبانیں رکھتی ہی۔ کپڑے کو کترتی ہی۔ کاغذ کو کاٹتی ہی۔ اور کاٹنے کترنے کے ہر قسم کے کام انجام دیتی ہی۔ کپڑا سینے والے درزیوں کے پاس۔ بال کاٹنے والے حجاموں کے پاس۔ جلدیں بنانے والے کاغذیوں کے پاس۔ جہاں دیکھئے قینچی اپنا کام کرتی نظر آئیگی۔ ڈاکٹر بھی زخمیوں کے سڑے ہوئے زخموں کی کاٹ چھانٹ میں اس قینچی سے ہمیشہ کام لیگا۔ لوہا کہتا ہی میں اپنے وجود سے بنی ہوئی قینچی کے بے شمار کاموں پر فخر کرتا ہوں

کہ کائنات کی سرگذشت میں قینچی کی خدمات میرے لئے باعث سرخروئی ہیں۔

گھاس کاٹنے کی قینچی

تم نے دیکھا باغوں میں اونچی نیچی گھاس کو برابر کرنے کے لئے لوہے کی ایک مشین چلائی جا رہی ہے۔ جو مغرور گھاس کے اونچے سر کو کتر کتر کر چھوٹے بڑے تنکوں کو برابر کیا بنا رہی ہے۔ یہ بھی لوہے سے بنی ہے۔ باغوں کی خوشنمائی اور چمن بندی کے لئے اس قینچی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور جب اس قینچی سے گھاس کو کاٹکر برابر کر دیا جاتا ہے تو وہ باغ کے سیر کرنے والوں کی آنکھوں کو بہت اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی نظر اونچا نیچا چھوٹا بڑا دیکھنے سے خوش نہیں ہوتی بلکہ دائرہ مساوات و یکسانیت میں دیکھکر آنکھیں خوش ہوتی ہیں۔ لوہے کی سرگذشت میں گھاس کاٹنے کی یہ قینچی بھی اپنا نام لکھوا کر خوش ہو رہی ہے اور کہتی ہے کہ لوہے کی بیتی میں لو میرا ذکر بھی آ گیا۔

ہل کی پھالی

کیسی تیز چلچلاتی دھوپ میں کھیت والا کسان ہل چلا رہا ہے۔ یہ ہل لکڑی سے بنایا جاتا ہے مگر اس کی پھالی لوہے کی ہوتی ہے جو زمین کو ایک ایک بالشت کھودتی ہوئی چلی جاتی ہے جب ہل چلا چکتے ہیں تو کسی چیز کے بیج اس کے اندر ڈال دیتے ہیں۔ جب تک ہل نہ چلائے جائیں اور زمین کو کھودا نہ جائے اس وقت تک کوئی بیج نشو و نما نہیں پا سکتا۔ یہی حال انسانی وجود کا ہے کہ جب وہ اپنے بطون میں روحانی ترقی کی کھیتی کرنی چاہتا ہے تو اس کو مشقت اور ریاضت کے ہل چلا کر بدن کی سرزمین کو تہ و بالا کر دینا پڑتا ہے۔

ہل کی پھالی لوہے کی ہے اس واسطے اس کا فخریہ دعویٰ بالکل حق بجانب ہے کہ میں انسانوں اور حیوانوں کی خوراک کے لئے ابتدائی بنیاد رکھتی ہوں اور جتنی غذائیں کھیتی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں اُن سب کی پیداوار میرے باعث سے ہوتی ہے اور میں انسانوں کے لئے اور حیوانوں کے لئے ہر قسم کی خوراک مہیا کرنے کی ابتدا کرتی ہوں اس واسطے میری سرگذشت لوہے کی سرگذشت میں قابل یادسرگذشت ہے۔

کھرپہ

ذرا دیکھنا میاں گھسیارے کو جنگل میں بیٹھے کھرپہ سے گھاس کھود رہے ہیں۔ کھرپہ لوہے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے پانچ چھ انگل چوڑا چکلہ۔ اس پر لوہے کی دستی لگا لیتے ہیں اور پھر اس سے گھاس کھودتے ہیں۔ جب کھرپہ سے گھاس کھودی جاتی ہے تو گھاس کی جڑیں ضائع نہیں ہوتیں۔ اور آٹھ دن کے بعد جڑوں سے نئی گھاس پیدا ہو جاتی ہے۔ اس واسطے کہنا چاہئے کہ کھرپا بڑا عقلمند اور دور اندیش اوزار ہے وہ گھاس کو اس طرح کھودتا ہے کہ اوپر کا حصہ کٹ جائے اور گھسیارے گھاس کو بیچکر اپنی روزی حاصل کرلیں اور گھوڑے گدھے وغیرہ جانور اس گھاس سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ اس لئے کھرپہ کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ لوہا میرے کام پر کائنات بیتی کی مجلس میں فخر کر سکتا ہے کہ میں انسان وحیوان دونوں کے کام آتا ہوں۔

اُسترہ

بال مونڈنے کا اوزار ہے۔ بہت تیز ہے بہت چمکیلا ہے۔ اور بڑا ہی دھاردار ہے۔ پہلے اس سے سر کے بال مونڈے جاتے تھے مگر اب ڈاڑھی مونچھ مونڈنے کے کام میں مصروف رہتا ہے ہر روز صبح کے وقت جب ہندو اپنے مندروں میں پوجا کرتے ہیں اور مسلمان مسجدوں میں خدا کے سامنے سجدہ کے لئے جمع ہوتے ہیں ٹھیک اُسی وقت کچھ لوگ چہرہ پر سفید صابن ملکر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ سے ڈاڑھی مونچھ کو مونڈتے نظر آتے ہیں۔

استرہ لوہے کا ہے اور وہ بزم کائنات کی داستان میں پکار پکار کر کہتا ہے کہ بال منڈانا جائز ہو یا ناجائز۔ اچھا ہو یا بُرا۔ مفید ہو یا غیر مفید مجھے اس سے بحث نہیں مجھے تو صرف اس قدر کہنا ہے کہ میں آجکل کروڑوں آدمیوں کے کام آتا ہوں۔ اور اگر میری جنس لوہا کائنات میں موجود نہ ہوتی تو لوگ شیشہ سے اپنے بالوں کو کاٹا کرتے۔ یا نوکدار پتھروں سے ڈاڑھی مونچھ کو رگڑ کر چہروں کو لہولہان کیا کرتے۔ لیکن لوہے کا احسانمند ہونا چاہیئے کہ اس سے میری شکل بنا دی گئی۔ اور آج کل تو ایک نئی قسم کا اُسترہ ایجاد ہوا ہے جو بہت آسانی سے ڈاڑھی مونچھ کو صاف کر دیتا ہے۔ بہر حال میں لوہے کا بیٹا حجام کی کسوت میں لیٹا۔ انسان کی موجودہ ضروریات فیشن کا ساتھی نہایت خوشی سے اپنی سرگذشت

کستا تا ہوں کہ میں بھی بے شمار مخلوق الٰہی کے کام آتا ہوں۔

رس کے بیلن

سردی کا موسم آیا۔ گنّے کے کھیتوں میں رس نکالنے کے بیلن لگ گئے لال لال گنّے ان دو بیلنوں کے بیچ میں لگے جاتے ہیں اور یہ بیلن چکر لگا کر اُن کا رس نچوڑ کر باہر برتن میں ڈالتے جاتے ہیں پھر اس رس کو چھان کر آگ میں پکا کر گڑ بنا لیتے ہیں شکر بنا لیتے ہیں اور سب مٹھائیاں اسی رس سے نمودار ہوتی ہیں۔

یہ بیلن بھی لوہے کے ہوتے ہیں کوئی کہے یہ بڑے ہی بے رحم ہیں بچارے گنّے کا کچومر نکال ڈالتے ہیں تو اس سے کہدو کہ بھائی جب تک گنا بیلن میں جا کر برباد نہ ہو دنیا یہ میٹھی چیزیں کہاں سے کھائے۔ دوائیوں کے لئے شربت کیونکر بنیں۔ طرح طرح کی مٹھائیاں کس طرح تیار ہوں۔ اس دنیا میں تو یہی چکر چل رہا ہی ایک فنا ہوتا ہی اور دوسرا اِس فنا سے اپنی بقا حاصل کرتا ہی کیا نہ دیکھتے نہیں سردی کے موسم میں بچارے کوئلے آگ میں جل جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ لیکن آگ سیکنے والوں اور کھانا پکانے والوں اور چاء بنانے والوں اور حقہ پینے والوں کو کوئلوں پر کبھی بھی رحم نہیں آتا۔ پانی بچارہ باغ میں جا کر زمین میں جذب اور فنا ہو جاتا ہی اور اپنی ہستی مٹا دیتا ہی تب درختوں میں پھل پھول پیدا ہوتے ہیں دانا خاک میں ملکر اپنا وجود نابود کرتا ہی۔ تب بہت سے دانے پیدا کرنے والا پودا زمین کے باہر نمودار ہوتا ہی۔ یہی حال رس کے بیلنوں کا ہی انہیں تم الزام نہیں دیسکتے نہ اس جنس کو مطعون کرسکتے ہو جس سے وہ بیلن بنے ہیں۔ کیونکہ وہ جس وقت سے بنتے ہیں اس وقت سے لیکر اپنی عمر کے آخر تک برابر انسانی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور یہی وجہ ہی کہ آج لوہے کی جنس بزم کائنات ہستی میں رس کے بیلن کو لیکر آئی ہی اور آپ کے سامنے اُسکی زبانی میں نے بیلن کی یہ سرگذشت سنائی ہی۔

گھاس کاٹنے کی مشین

میں حیوانوں کے لئے بنی ہوں تاکہ حیوانوں کی غذا مہیا کروں۔ قدرت نے ہر جاندار کو اپنی غذا کھانے اور چبانے کے لئے اُن کے جسم کے ساتھ سامان دیا ہی مگر جو جانور

انسان کے ماتحت ہیں اور جن کی غذا انسان کو مہیا کرنی پڑتی ہے وہ آدمی کے بنائے ہوئے آلات سے اپنی غذا مہیا کراتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی اسی قسم کا ایک آلہ ہوں اور باجرہ اور جوار اور مکئی کے لمبے لمبے درختوں کو جنکو "پولیاں" کہا جاتا ہے چھوٹا چھوٹا کتر کر جانوروں کے کہانے کے قابل بنا دیتی ہوں۔

پہلے انسان گنڈاسہ سے جانوروں کا چارہ کاٹتا تھا اور وہ گنڈاسہ بھی لوہے کا ہوتا تھا۔ مگر گنڈاسہ کے ذریعہ کٹی بہت دیر میں تیار ہوتی تھی۔ جب سے میں مشین تیار ہوئی ہوں کٹی کاٹنے کی بڑی آسانی ہوگئی ہے اور جتنی کٹی ایک آدمی دو گھنٹے میں کاٹتا تھا اُتنی کٹی میں پانچ منٹ میں تیار کر دیتی ہوں۔

لوہے کی ہوں اور گنڈاسہ بھی لوہے کا ہوتا ہے۔ میرے باعث سے جانوروں کو غذا ملتی ہے اور انسان کو بھی غذا ملتی ہے۔ کیونکہ جو آدمی مجھے چلاتے ہیں اور میرے ذریعہ سے کٹی کاٹتے ہیں اُنکو بھی اس محنت کا معاوضہ دیا جاتا ہے اور اس معاوضہ سے اُنکے پیٹ کی غذا تیار ہوتی ہے تو گویا میرا وجود انسان اور حیوانوں کے لئے یکساں مفید ہے اور اس لوہے کی سرگذشت بیان کرتے وقت اپنے وجود کو فخر اور مباہات سے پیش کر سکتی ہوں کہ مجھ سے فائدہ سب کو ہے اور نقصان کسی کو بھی نہیں۔

درانتی

میں کھیت کاٹنے کا آلہ اور گھاس کاٹنے کا اوزار ہوں۔ انگریزی عبارت میں سوالیہ فقرے کے آخر میں جو نشان بناتے ہیں وہ میرا ہم شکل ہوتا ہے۔ میں حضرت آدم کے وقت سے آجتک ایک ہی شکل کی ہوں۔ جب ہابیل اور قابیل آپس میں لڑے تو میں موجود تھی اور وہ دونوں مجھی سے اپنے کھیت کاٹا کرتے تھے۔ کھیت کی سرسبزیاں اور کھیتیاں اگر میری شکایت کریں کہ درانتی ہمکو کاٹ ڈالتی ہے تو اُنکی شکایت ٹھیک ہوگی۔ لیکن اور کوئی انسان وحیوان میری شکایت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں سب کے لئے مفید ہوں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی اور کھیتی کی شکایت بھی کچھ زیادہ حق بجانب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر میں کھیتی کو نہ کاٹوں تو وہ سوکھ سوکھ کر خاک ہو جائے اور انسان کے کسی کام نہ آئے۔ حالانکہ اس کو انسانی فائدہ کے لئے بویا جاتا ہے۔

بہرحال لوہے کی سرگذشت میں میری بپتی اور میرا بیان ایک تاریخی بیان

ہے ۔ کیونکہ میں ہزار ہا برس سے انسان اور حیوان کی خدمت کر رہی ہوں اور لوہا میرے وجود پر اس کائنات میں فخر کر سکتا ہی شرمندہ نہیں ہو سکتا ۔

موچی کے اوزار

میرا نام رینبی ہے چمڑا چھیلتی ہوں اور اس کو جوتیاں بنانے کے قابل بناتی ہوں ۔ میں سر سے پاؤں تک لوہے کی ہوں اور انسان کو گرم زمین اور گیلی زمین اور ٹھنڈی زمین سے بچانے کے لئے جوتیاں تیار کراتی ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں لوہے کی ہوں ۔

ایسے ہی میرے اور کئی بھائی بہن ہیں ۔ کوئی چمڑے میں سوراخ کرتا ہی اور کوئی چمڑے کو سیتا ہی اور کوئی جوتیوں میں کوکا اور کیل بنکر لگایا جاتا ہی ۔ اور کوئی نعل بنکر جڑا جاتا ہی ۔ غرض انسان کی جوتیاں میری ہی برادری کی امداد سے تیار ہوتی ہیں اگرچہ وہ جوتیاں چمڑے کی بنتی ہیں لیکن مجھ لوہے کی قوم اس چمڑے کے کام کو بناتی ہی ۔ اس واسطے لوہے کے بیان میں میرے خاندان کا بیان بھی ایک خاص وقعت رکھتا ہی ۔

میرے خاندان کے ذریعہ مسلمان موچی بھی جوتیاں بناتے ہیں اور ہندو چمار بھی جوتیاں سیتے ہیں اور میں مسلمانوں کے کام بھی آتی ہوں اور چماروں کو بھی مدد دیتی ہوں اور مجھکو کسی کی امداد سے دریغ نہیں ہی ۔

مچھلی کے شکار کے کانٹے

ہم بھی لوہے کے ہیں کچھ بڑے ہیں کچھ درمیانی اور کچھ چھوٹی چھوٹی کانٹیاں ہیں ۔ ہمکو مچھلیوں کے شکار کے لئے کام میں لایا جاتا ہی ۔ انسان ہمارے منہ کو گوشت یا اور کسی ایسی چیز سے چھپا دیتا ہے جو مچھلیوں کو مرغوب ہو اور اس کے بعد ہم کو دریا میں یا تالاب میں یا جھیل میں یا سمندر میں جہاں اس کو مچھلیاں ملنے کی توقع ہو ڈال دیتا ہی ۔ ہمارے پیچھے ایک ڈور بندھی رہتی ہی اور ہمارے قریب ایک سرکنڈا یا کوئی اور ہلکی چیز باندہ دی جاتی ہی جس کو "ترونا" کہتے ہیں ۔ یہ ترونا پانی میں تیرتا رہتا ہی اور بے خبر مچھلیاں ہم کانٹوں کو اپنی غذا اور خوراک